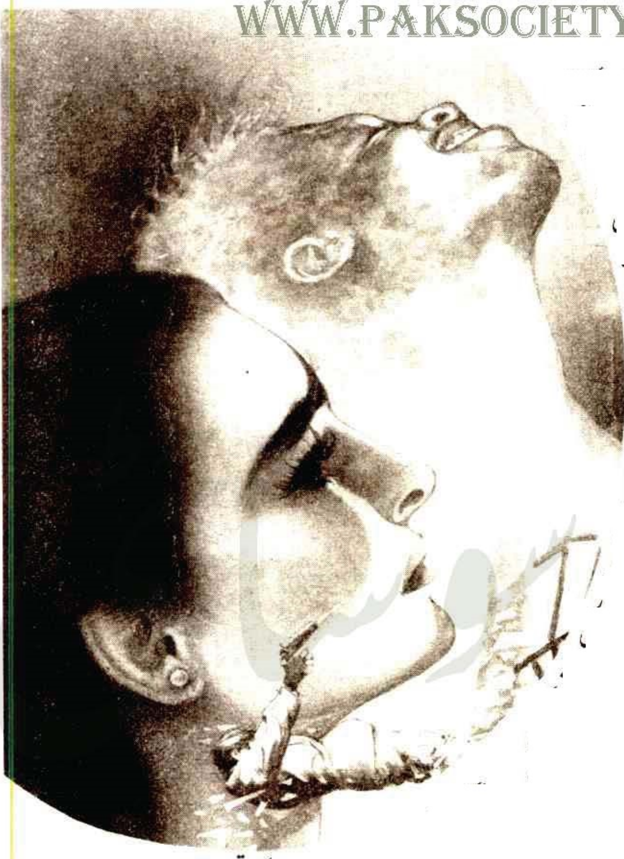


گھاؤ

اسماقادری

گھاؤ

اسما قادری

جو لوگ تجربات کی تیز آگ میں جلتے ہیں ...وہ جھلس کر خاک نہیں ہوتے... بلکہ زندگی کی تازگی ...لطافت اور شگفتگی ان کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے... مگر کچھ لوگ جذبات کی تیز آندھی میں اس طرح اڑتے ہیں ... کہ ان کی رفتار ... گفتار اور کردار سب اس کی نذر ہوتا چلا جاتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کا احوال جس کی رگوں میں سچائی ...دیانت ... محبت کا خون رواں تھا ... مگر اچانک ہی زندگی برتنے کے تقاضے بدلنے لگے... خلوص اور سچائی میں ملاوٹ کا عنصر بڑھنے لگا وہ زندگی کے آخری وار کا ایسا شکار ہوا جس کا گھاؤ تاعمر مندمل نہ ہو سکا۔

معاشرتی و معاشی بگاڑ... بھوک و افلاس اور تنگدستی جیسے

عوامل کا سفاکانہ شاخسانہ

''چائے۔''

میں آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ صدف کی کھنک دار آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے دروازے پر کھڑی تھی اور صبح کی طرح ہی صبیح لگ رہی تھی۔ اس نے آسمانی اور ہلکے گلابی رنگوں کے امتزاج والا لان کا عام سا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا وہ جو بھی پہن لیتی اس پر بے حد کھلتا تھا۔

''چائے پینی ہے یا نہیں۔'' مجھے مسلسل خود کو تکتے دیکھ کر اس نے قدرے جارحانہ انداز میں ٹوکا۔ یہ جارحانہ انداز وہ میرے جذبوں کو بے لگام ہونے سے روکنے کے لیے جان بوجھ کر اپناتی تھی اور شرم کے باعث رخساروں پر ابھرنے والی سرخی کو غصے کی سرخی کا رنگ دینے کی کوشش کرتی تھی۔

''شربتِ دیدار تو نوش جان کر لیں پھر چائے بھی پی لیں گے۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا کہ لمحہ بھر کے لیے ہی سہی جب اس کی گھنیری پلکیں شرم سے لرزتی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا لیکن حسبِ معمول اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تائی امی سے جا کر کہہ دیتی ہوں کہ آپ کا چائے پینے کا موڈ نہیں ہے۔'' اس نے دروازے کی طرف رخ موڑا۔

''رک جاؤ ظالم حسینہ ..... یہاں پہلے ہی ٹینشن کی وجہ سے انڈے پراٹھے کے ساتھ بھرپور انصاف نہیں ہو سکا اس پر تم چائے سے بھی محروم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ خالی پیٹ میں کیا خاک انٹرویو دوں گا۔'' میری دوہائی نے اس کے قدم روک دیے اور اس نے چائے کی پیالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

''دعا کرنا کہ میں کامیاب رہوں۔'' چائے کا پہلا گھونٹ بھر کر میں نے اس سے فرمائش کی۔

''آپ کو کہنے کی ضرورت ہے کیا؟'' اس کے یاقوتی لبوں پر شکوہ مچلا۔

''نہیں ضرورت تو نہیں ہے پر کہہ دینے سے دل کو کچھ تقویت سی حاصل ہوتی ہے۔'' میں نے پوری سچائی سے اسے جواب دیا۔

حقیقت یہی تھی کہ مجھے اپنے لیے اس کی دعاؤں کا پورا

یقین تھا۔ وہ میری غیر اعلانیہ منگیتر تھی۔ بزرگوں کی ایک عام عادت کے مطابق ہماری دادی جان نے اس کی پیدائش کے فوراً بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ میرے ''کامی'' کی دلہن بنے گی۔ آنے والے وقتوں میں دادی کی اس بات کو کسی باقاعدہ بندھن میں تو تبدیل نہیں کیا گیا لیکن بات بہرحال اپنی جگہ برقرار رہی جس کا ثبوت اس صورت ملتا رہا کہ مختلف رشتے داروں یا عزیزوں کی طرف سے جب بھی مجھے یا صدف کو اس حوالے سے چھیڑا گیا تو دونوں ہی کے بزرگوں میں سے کسی نے کوئی اعتراض کیا نہ تنبیہی جملہ کہا۔ باقاعدہ منگنی نہ کرنے کا شاید یہ سبب تھا کہ ہم ایک ہی مکان میں رہائش پزیر تھے۔ دادا کی طرف سے ورثے میں ملنے والے اس اسی گز کے مکان کو ابا اور چچا نے مل کر ازسرِنو تعمیر کروایا تھا۔ اوپر کے پورشن میں چچا اور نیچے ہم لوگ رہتے تھے۔ دونوں ہی گھروں میں بچوں کی نفری برابر تھی۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے جبکہ چچا نے تیسری بیٹی کی پیدائش پر ہار مان کر بیٹے کی خواہش سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ دونوں گھرانوں میں رواداری تھی سو خوش اسلوبی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ حالات وہی تھے جو عام سے سفید پوش گھرانوں میں ہوتے ہیں لیکن پچھلے ایک سال سے ہمارے گھر کے حالات ذرا سخت ہو چلے تھے کیونکہ ابا جان میرے ایم اے کے آخری پیپر والے دن بالکل اچانک ہی ہارٹ فیل کی وجہ سے ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ ہائی اسکول میں کیمسٹری کے ٹیچر تھے اور جیسا کہ گورنمنٹ کے اداروں کا دستور ہوتا ہے کہ ریٹائرڈ یا فوت شدہ شخص کے واجبات کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر کی جاتی ہے کہ اگر آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو فاقوں تک نوبت چلی جائے، یہی صورتِ حال ہمارے ساتھ پیش آئی۔ آٹھ ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں واجبات کے حصول اور امی کے نام پنشن جاری کروانے میں کامیاب ہو پایا۔ اس عرصے میں، میں خود بھی اپنے لیے کسی معقول ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں رہا لیکن تاحال ناکام ہی تھا اور ایک ٹیوشن سینٹر میں اکنامکس اور انگریزی پڑھا کر گزارہ کر رہا تھا۔ اس مختصر آمدنی میں چار افراد پر مشتمل ایک ایسے گھرانے کا جس میں دو بچے بالترتیب ایف ایس سی اور میٹرک کے طالب علم ہوں، گزارہ ویسے ہی مشکل تھا کہ قسمت کی ستم ظریفی سے امی بھی شدید بیمار ہو گئیں۔

انہیں بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ ابا جان کو ملنے والے فنڈ کی رقم ان کے علاج کے سلسلے میں خرچ ہو گئی اور مکمل صحت یابی سے پہلے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ چچا نے ان حالات میں حتی المقدور ساتھ دیا لیکن وہ خود محدود آمدنی والے آدمی تھے جن پر تین بیٹیوں کی ذمے داری تھی۔ ایک حد سے آگے وہ بھی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ البتہ ان کے اہلِ خانہ کی طرف سے اخلاقی تعاون مسلسل جاری تھا۔ چچی دن میں دو تین بار نیچے کا چکر لگا کر امی کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں جبکہ ان کی تینوں بیٹیاں بھی میری چھوٹی بہن شمائلہ کے ساتھ گھریلو ذمے داریاں ادا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھیں بلکہ دیکھا جائے تو زیادہ تر کام صدف اور اس سے چھوٹی عاشفہ ہی کر ڈالتی تھیں۔ شمائلہ کو ایک تو چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھریلو کام کاج میں مہارت نہیں تھی۔ دوسرے اس کی پڑھائی کی بھی مصروفیت تھی۔ میٹرک کا تعلیمی سال ہر اچھے طالب علم کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اسی لیے صدف اور

عاشفہ اس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ سب سے چھوٹی سنبل تو خیر تھی ہی شمائلہ کی عمر کی جو اسے امی کی بیماری کی ٹینشن سے نکال کر اپنے ساتھ پڑھائی میں مصروف رکھتی تھی۔

''اللہ نے چاہا تو آج آپ ضرور کامیاب لوٹیں گے۔ میں رات سے آپ کی کامیابی کے لیے خصوصی دعائیں کر رہی ہوں اور میرے دل کو یقین سا ہو چلا ہے کہ آج ضرور آپ انٹرویو میں کامیاب رہیں گے۔'' اپنی ملائم آواز میں بولتی وہ میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

''اللہ تمہارے اس یقین کی لاج رکھے۔'' میں نے جواب میں آہستہ سے کہا اور چائے کی خالی پیالی اسے واپس تھما کر صوفے کے نیچے رکھے جوتے نکال کر پہننے لگا۔

''شوز تو بڑے شاندار ہیں۔ برانڈڈ لگتے ہیں۔'' جوتوں کو دیکھ کر صدف نے تبصرہ کیا تو میں یکدم بوکھلا سا گیا۔ اپنے اس تبصرے میں اس نے ایک جملہ نہیں کہا تھا کہ یہ اتنے مہنگے اور قیمتی جوتے مجھ جیسے قلاش کے پاس کہاں سے آئے لیکن ظاہر ہے وہ جانتی تھی کہ کل دوپہر تک میرے پاس یہ جوتے موجود نہیں تھے اور نہ ہی میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں اتنے مہنگے تو کیا کوئی نسبتاً کم قیمت ہی جوتوں کی جوڑی خرید پاتا۔

''انٹرویو کے لیے ایک دوست سے مانگ کر لایا ہوں۔'' میں نے نظریں جھکا کر جوتے پہنتے ہوئے اسے جواب دیا کہ نظر ملا کر اس سے جھوٹ بولنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے میں امید وبیم کے درمیان جھول رہا تھا۔ اشتہار میں انہوں نے اکاؤنٹس کے شعبے کے لیے جو کوالیفکیشن طلب کی تھی وہ میرے پاس موجود تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس اشتہار کو پڑھ کر میرے جیسے کئی انٹرویو کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں گے اور یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں سب کو مات دیتا ہوا اس ملازمت کے لیے منتخب ہو جاتا۔ تیسری منزل کے ہال نما کمرے میں پہنچ کر میری ان تین افراد سے ملاقات ہوئی جو آج کے انٹرویو میں میرے مقابل تھے۔ شکل وصورت اور حلیے سے وہ سب بھی میری ہی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ضرورت مند جوان ہی محسوس ہوئے تھے۔ اپنا نام سیکریٹری نما لڑکی کے پاس درج کروا کر میں ان تینوں کے ساتھ ہی قطار میں بیٹھ گیا۔ میرے بعد وہاں دو افراد مزید آئے اور یوں امیدواروں کی تعداد چھ ہوگئی۔

انٹرویو ٹھیک وقت پر شروع ہوا اور اندر جانے والے پہلے امیدوار کے ساتھ ہی مجھ سمیت شاید سب ہی کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ہم دبی آواز میں آپس میں گفتگو کرتے اندازے اور تخمینے لگانے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکلا تو ویسے ہی امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکا ہوا تھا جیسے انٹرویو سے قبل۔ ظاہر ہے انٹرویو لینے والے نے اسے فوری طور پر تو کوئی حتمی جواب نہیں دیا ہوگا اور یہی کہا ہوگا کہ بعد میں آپ کو فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ سچ بات ہے کہ مجھے خود وہ بندہ بس یوں ہی سا لگا تھا اور اسے میں نے خود ہی اس جاب کے لیے مسترد کر دیا تھا۔ اپنے ساتھ وہاں موجود پانچ افراد میں سے حقیقتاً مجھے صرف دو امیدواروں سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ایک وہ اسکائی بلیو شرٹ والا اسمارٹ سا لڑکا تھا جو بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا اور اپنے انداز سے ہی خاصا تیز طرار اور ذہین محسوس ہوتا تھا جبکہ دوسری سب سے آخر میں آنے والی گندمی رنگت اور تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اکثر جگہوں پر خوش شکل اور کوالیفائیڈ لڑکیوں کو مردوں پر ترجیح دینے کا رجحان ہو چلا ہے اس لیے وہ لڑکی مجھے اپنی سب سے زیادہ سخت حریف محسوس ہو رہی تھی۔ مختلف قسم کے خیالات وجذبات دل ودماغ میں لیے آخر کار وہ وقت بھی آگیا جب سیکریٹری نے میرا نام پکار کر مجھے انٹرویو کے لیے اندر کمرے میں جانے کو کہا۔ میں خود کو مجتمع کرتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا جو میری روٹھی ہوئی قسمت کو کھولنے کا سبب بن سکتا تھا۔

''پلیز سٹ ڈاؤن۔'' میز کے قریب پہنچنے پر مہنگے تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی بلغمی آواز میں مجھے حکم دیا تو میں تھینک یو کہتا ہوا کرسی پر ٹک گیا۔ میں نے اس کے اشارے پر اپنے ڈاکومنٹس کی فائل اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے فائل کھول کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور اپنی تیز نگاہوں کو کچھ دیر تک میرے چہرے پر جمائے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا یہ انداز خاصا کنفیوز کرنے والا تھا سو میں نروس ہونے لگا۔

''مسٹر کامران احمد۔'' آخر کار اس کی آواز میری سماعتوں تک پہنچی۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے جو شوز پہن رکھے ہیں وہ آپ نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟'' اس نے گویا میری سماعتوں میں بم بلاسٹ کر دیا۔ میں کچھ پل کے لیے حواس باختہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ بہت گہرائی تک اندر اتر جانے والی وہ آنکھیں گویا مجھے پوری طرح پڑھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ میں

صدف کی طرح اس سے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن سچ بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں حد سے زیادہ کنفیوز ہوگیا۔ اس انٹرویو کے لیے میں نے بہت تیاری کی تھی لیکن اس نے تو پہلا ہی سوال لاجواب کر ڈالا تھا۔ یکدم ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے خیال آیا کہ آخر اس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہی کیوں ہے؟ کیوں کا جواب کسی الہام کی طرح مجھ پر اترا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں اس سے صرف سچ بول سکتا ہوں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس سچ میں اتنی اثر پذیری ہو کہ میرے حق میں کوئی بہتر نتیجہ نکل آئے چنانچہ میں گلا کھنکھارتے ہوئے بولنے کے لیے تیار ہوگیا اور معتدل آواز میں بولنے لگا۔

''آپ کا سوال میرے لیے حیرت انگیز ہے سر لیکن شاید یہ آپ کی نظر کی گہرائی ہے کہ آپ نے میرے اور ان جوتوں کے درمیان موجود نامطابقت کو محسوس کرلیا۔ ظاہر ہے ان کی قیمت میری حیثیت سے بہت اونچی ہوگی۔ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے یہ جوتے اس انٹرویو کے لیے اپنے کسی دوست سے مستعار لیے ہیں تب بھی شاید آپ کو یقین نہ آئے کیونکہ آدمی کے دوست بھی عموماً اسی کی حیثیت کے ہوتے ہیں۔ ان جوتوں کی حالت ایسی بھی نہیں ہے کہ میں انہیں سیکنڈ ہینڈ خریدنے کا دعویٰ کروں چنانچہ میرے پاس ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ میں آپ سے سچ بولوں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سچ کے بعد مجھے یہاں ملازمت ملنے کا امکان صفر ہی رہ جائے گا لیکن کم از کم اتنا تو ہوگا کہ میں جھوٹ کے بوجھ سے آزاد ہوجاؤں گا۔'' حقیقت بتانے سے قبل میں نے وہ تمہید باندھی جو حالات کو میرے حق میں بہتر کرسکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے والد کی وفات، والدہ کی بیماری اور چھوٹے بھائی بہن کی کفالت کی ذمے داریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی معاشی صورتِ حال اور اس ملازمت کے حصول کے لیے اپنی طلب کی شدت سے اس کو آگاہ کیا اور مزید بولا۔

''ان حالات کو سن کر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ میں ایک مناسب ملازمت کے حصول کا کتنی شدت سے خواہش مند ہوسکتا ہوں۔ آپ نے اشتہار میں اس ملازمت کے لیے جو کوالیفکیشن مانگی تھی وہ میرے پاس تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ صرف ڈگری اٹھا کر ملازمت کے حصول کے لیے انٹرویو دینے نہیں جایا جاتا۔ اپنی قابلیت سے پہلے اپنا سراپا بھی سلیقے سے پیش کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے لباس اور اچھے جوتے اہم لوازم ہیں۔ اچھے دنوں میں ایک عزیز کی شادی پر بنایا گیا یہ سوٹ میں نے عرصے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا لیکن جوتے کثرتِ استعمال سے خراب ہوگئے تھے۔ مناسب جوتوں کی فکر میں مبتلا کل میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا تو وہاں مجھے یہ جوتے نظر آگئے اور مجھے لگا کہ میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ کسی بری نیت سے نہیں، صرف اور صرف اس انٹرویو کے لیے میں نے یہ جوتے مسجد سے حاصل کر لیے۔ ارادہ یہی تھا کہ انٹرویو سے فارغ ہوکر جوتے واپس مسجد میں لے جاکر رکھ دوں گا۔ معلوم نہیں تھا کہ اللہ کے گھر کی گئی پہلی چوری کا حساب اتنی جلدی اور اس جگہ دینا پڑے گا۔''

آخر میں میرے ہونٹوں پر خود بخود ہی ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انٹرویو لینے والے نے میرا یہ پورا بیان بغیر کسی مداخلت کے خاموشی سے سنا اور بعد میں بھی کچھ دیر تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نظریں جھکا کر بیٹھا تھا اور اس کی خاموشی کے یہ پل میرے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھے۔ میں نے سچ بول کر ایک داؤ کھیلا تھا اور اب دیکھنا یہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

''تمہارے سچ نے مجھے خوش کیا۔ تم چاہے کتنا ہی اچھا جھوٹ بولتے مجھے دھوکا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ جوتے میرے ہی ہیں۔'' اس کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو میں نے دل میں ''یاہو'' کا نعرہ مارا اور خود کو شاباش دی کہ صحیح وقت پر بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ اس کا سوال سن کر مجھے یہی گمان گزرا تھا کہ ہو نہ ہو یہ جوتے اسی کے ہیں ورنہ کوئی دوسرا شخص انٹرویو لیتے وقت اتنا بے ہودہ سوال کیسے کرسکتا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی اندرونی خوشی کا تاثر چہرے پر نہیں آنے دیا اور وقت کے تقاضے کے مطابق شرمندگی اور ندامت سجالی۔

''میں کوئی نمازی آدمی نہیں ہوں لیکن کل اتفاق سے ایک پارٹی کو پروجیکٹ دکھانے لے گیا تو راستے میں ہی نماز کا ٹائم ہوگیا۔ وہ نمازی ٹائپ کے بندے تھے چنانچہ ان کی خواہش پر مجھے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانا پڑا۔ واپسی میں جوتے غائب تھے۔'' اب وہ دوستوں کی طرح مجھے خود پر کل گزرے واقعے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

''آئی ایم ویری سوری سر، میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں نے کس مجبوری کے تحت اور کس نیت سے آپ کے جوتے چرائے تھے۔'' میں نے اس بار زبان سے بھی اظہار شرمندگی کو ضروری سمجھا۔

''اِٹس او کے۔ جو ہوا سو ہوا۔ شاید اسی طرح ہماری

ملاقات طے تھی۔ اس واقعے کے سبب مجھے تمہیں زیادہ اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ تمہارے سچ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم پابندی سے نماز پڑھتے ہو؟'' بولتے بولتے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔

''نہیں، بس جمعے کے جمعے حاضری لگانے چلا جاتا ہوں۔'' میں بھی آج صاف گوئی کے ریکارڈ قائم کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ محسوس یہی ہو رہا تھا کہ سچ بولنے سے فائدہ ہو رہا ہے ورنہ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے کوئی ایسا کارِ دشوار نہیں تھا۔ مجھے اس فن میں بھی ٹھیک ٹھاک مہارت حاصل تھی۔

''مسٹر کامران احمد!'' اس نے اپنی اندر تک اتر جانے والی آنکھیں میری آنکھوں پر فوکس کیں اور کچھ ایسے انداز میں میرا نام پکارا کہ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''تم سے بات کر کے محسوس ہوتا ہے کہ تم ہی ہمارے مطلوبہ فرد ہو اس لیے میں نے اس ملازمت کے لیے تمہارا انتخاب کر لیا ہے۔ تین ماہ کی آزمائشی مدت میں اگر تم نے اپنے انتخاب کو درست ثابت کر دکھایا تو تمہاری جاب مستقل ہو جائے گی اور سیلری میں اضافے کے علاوہ وہ ساری مراعات حاصل ہوں گی جو ہم اپنی کمپنی کے ملازمین کو دیتے ہیں۔'' آخر کار اس نے مژدہ سنا دیا۔ پہلے ہی کچھ کچھ اندازہ ہو جانے پر مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کیسا عجیب واقعہ ہوا تھا کہ انٹرویو لینے والے نے نہ تو میرے ڈاکومینٹس دیکھے تھے اور نہ ہی مجھ سے کوئی پیشہ ورانہ سوال کیا تھا اور میں صرف اور صرف ایک جوتے کی جوڑی چرانے کی وجہ سے منتخب کر لیا گیا تھا۔

''تم کچھ دیر باہر بیٹھو۔ میں تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر جاری کرنے کا آرڈر دیتا ہوں۔ لیٹر ساتھ لے کر ہی گھر جانا۔'' اس کے یہ الفاظ میں نے خواب کے سے عالم میں سنے اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت میری نظر اپنے پیروں میں موجود جوتوں پر پڑی۔

''یہ شوز سر۔۔۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''اب یہ تم ہی رکھ لو۔ تمہارے پیروں میں جچ رہے ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو میں نے یہ سوچتے ہوئے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے کہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ایسے منحنی سے آدمی کے جوتے کا ناپ مجھ جیسے ٹھیک ٹھاک قد کاٹھ کے بندے کے برابر ہے۔ یعنی اس کے پاؤں اپنی جسامت کی مناسبت سے زیادہ بڑے تھے اور یقیناً اپنی شخصیت سے متضاد اتنے بڑے جوتے اس پر قطعی نہیں جچتے ہوں گے۔

☆☆☆

اس روز اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں لیے میں ایچ ایچ بلڈرز کے دفتر سے نکلا تو میرا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں مجھے بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے میں بھی کوئی کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے اسٹاپ پر زیادہ رش نہیں تھا شاید اسی وجہ سے بائک پر وہاں سے گزرتے میرے دوست فرہاد کی مجھ پر نظر پڑ گئی اور اس نے بائک میرے قریب روک دی۔

''اوئے کامی۔۔۔ یہاں کیسے یار؟'' اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''بس یار یہاں انٹرویو دینے آیا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''پھر کیا رہا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا پھر شاید خود ہی میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا سو ذرا جوش سے بولا۔ ''بلے بھئی بلے۔ لگتا ہے اپنا شیر بازی جیت کر آ رہا ہے۔''

''ہاں یار، اس بار لک کام کر گئی۔'' مجھے خود بھی کسی سے یہ خوشی بانٹنے کی بے چینی تھی۔ فوراً ہی اسے اطلاع دی، اس نے بھی مجھے مبارک باد دینے اور گلے لگانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔

''بڑی اچھی خبر سنائی تو نے۔ سن کر دل خوش ہو گیا۔ چل اب اس خوشی میں بھائی کو اچھی سی ٹریٹ تو دے دے۔'' مبارک باد کے بعد اس نے وہی مطالبہ کیا جو ایسے موقعوں پر دوستوں کی طرف سے ہوتا ہے لیکن میری جیب اس مطالبے کو پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے مجھے اس سے معذرت کرنی پڑی۔

''ابھی نہیں یار، سیلری کے بعد ہی یہ ٹریٹ وغیرہ کا چکر رکھیں گے۔''

''چل ٹھیک ہے جیسی تیری سہولت لیکن دیکھ بھولنا نہیں۔'' اس نے فوراً ہی سپر ڈال دی۔ دوست تھا اتنا تو سمجھ ہی سکتا تھا کہ میرے انکار کا کیا سبب ہو گا۔

''نہیں بھولوں گا بابا پر ابھی تو جانے دے۔ وہ دیکھ میرے روٹ کی بس آ رہی ہے نکل گئی تو پھر گرمی میں گھنٹا بھر انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے دور سے آتی بس کو دیکھ کر کچھ بے تابی کا مظاہرہ کیا۔

''کیا بات کرتا ہے۔ چل سیدھی طرح میرے پیچھے بیٹھ جا۔ میں چھوڑ دوں گا تجھے۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا

کہ مجھے انکار کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ سڑکوں پر بائک دوڑاتا اونچی آواز سے مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔ وہ تھا ہی ایسا لاابالی اور ملنسار سا لڑکا۔ دورانِ تعلیم بھی پورے ڈپارٹمنٹ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس سے اس کی جان پہچان نہ ہو۔ ہر ایک سے کھلے دل سے ملتا اور ہر دم ہنستا مسکراتا رہتا۔ مزاج کی اس خوش گواری میں شاید کچھ دخل مالی آسودگی کا بھی تھا۔ اب بھی اس نے بائک اچانک ایک ریسٹورنٹ کے سامنے لے جا کر روک دی۔

''یہاں کہاں؟'' میں نے اسے ٹوکا۔

''لنچ ٹائم ہے۔ چل کر کوئی پزا شزا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر گپ شپ بھی رہے گی۔ اتنے عرصے بعد ملے ہیں ذرا ڈھنگ سے ایک دوسرے کا حال احوال تو معلوم کرلیں۔'' وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ اندر کے ٹھنڈے ماحول میں پہنچ کر میرا موڈ بھی خوش گوار ہو گیا اور پھر واقعی ہم نے دل کھول کر باتیں کیں اور ایک دوسرے کو یونیورسٹی سے پاس آؤٹ کرنے کے بعد کے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ حسبِ توقع اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا لیکن چونکہ والد صاحب ابھی تک خود خاصے ایکٹو تھے اس لیے اس پر کوئی خاص ذمے داری نہیں تھی۔ میں نے بھی اپنے حالات کی تنگی کا احوال کچھ کاٹ چھانٹ کر اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ ذہین تھا یقیناً وہ سب بھی سمجھ لیا ہوگا جو میں نے کھل کر نہیں بتایا۔ اسی نے موضوع گفتگو بہت خوب صورتی کے ساتھ یونیورسٹی کے سنہری دنوں کی طرف موڑ دیا اور بیتی یادوں کو دہراتے وقت کتنی تیزی سے گزرا ہمیں خود اندازہ نہیں ہو سکا۔ کئی بہترین گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کے بعد جب اس نے مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کیا تو... سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ دروازہ صدف نے کھولا۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور پریشانی رقم تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔

''کہاں رہ گئے تھے؟ اتنی دیر لگا دی یہاں سب کو پریشانی ہونے لگی تھی۔'' اس نے کچھ خفگی سے کہا۔

''بس یار! باس کے آفس کے آگے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تھا کہ ملازمت دو گے تو یہاں سے جاؤں گا ورنہ نہیں۔'' میں نے شوخ لہجے میں جواب دیا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کامی! آپ کو جاب مل گئی۔'' خوشی کے مارے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔

''جی ہاں، میں تمہیں یہی بتا رہا ہوں۔'' میرے توثیق کر دینے پر اس کا چہرہ کھل اٹھا پھر ذرا سی دیر میں پورے گھر میں یہ خوش خبری پھیل چکی تھی۔ اوپر سے چچا کی بھی پوری فیملی اتر کر آگئی۔ چچا نے فوراً مٹھائی منگوا کر سب کو کھلائی۔ سارا گھر ایسے خوش تھا کہ جیسے آج عید کا دن ہو۔ صدف کا چہرہ تو مارے خوشی کے جگمگانے لگا تھا۔ امی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ اس نے ان کی سن لی۔ چچا کی فیملی بھی اس خوشی میں ہمارے ساتھ برابر کی شریک تھی لیکن وہ لوگ بس آدھا پون گھنٹا ہی نیچے ٹھہرے پھر چچی کے اشارے پر صدف سمیت تینوں بہنیں ان کے ساتھ اوپر چلی گئیں۔ ان لوگوں، خاص طور پر صدف کے چلے جانے سے میں کچھ بجھ سا گیا لیکن پھر چچا کی وضاحت نے سارا تکدّر دور کر دیا۔ انہوں نے بتایا۔

''عاشفہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ تمہاری چچی اور بچیوں کو اسی سلسلے میں کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ اس لیے جلدی اٹھ گئی ہیں۔ لیکن رات کو میری طرف سے دعوت پکی ہے۔ رات کا کھانا سب لوگ اوپر ہی کھائیں گے۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے چچا جان؟'' میں نے اخلاقاً انہیں منع کرنا چاہا۔

''تکلف کیسا؟ اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش ہونے کا ہمیں بھی حق ہے۔'' وہ صوفے پر میرے برابر میں ہی بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ آسانی سے مجھے اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ امی دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد چچا بھی اٹھ کر اوپر چلے گئے۔ امی سے شاید وہ لوگ پہلے ہی کہہ چکے تھے اس لیے جب رشتے کے سلسلے میں مہمان آئے تو امی بھی اوپر پہنچ گئیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد چچا کے پورشن میں ہم سب کی محفل جمی۔ چچی اور صدف کی محنت سے تیار کیے گئے پُرتکلف اور ذائقے دار کھانے نے خوشی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ رات گئے جب ہم سونے کے لیے نیچے آئے تو میں سوچ رہا تھا کہ ابا کے انتقال کے بعد یہ میری زندگی میں آنے والا پہلا دن تھا جو آغاز سے انجام تک اتنا خوش گوار رہا تھا اور یہ سب اس لیے تھا کہ میں ایک مناسب جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اچھی جاب کا مطلب تھا گھر کے ان بہت سے مسائل کا حل جو پیسے سے جڑے ہوئے تھے یعنی خوشی کا پیسے سے گہرا تعلق تھا ورنہ اس گھر کے مکین تو کل تک وہی تھے لیکن ایسی خوشی اور طمانیت کا کہیں گزر نہیں تھا۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز کے آفس میں میرا پہلا دن بہت اچھا گزرا۔ چیف اکاؤنٹنٹ سہیل صاحب نے بہت دوستانہ انداز میں مجھے میرے کام کی نوعیت سمجھائی۔ ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ کوئی کام سمجھ نہ آنے کی صورت میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جب چاہوں ان سے کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے اس مہربانی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور تن دہی سے ان فائلوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا جو انہوں نے میرے حوالے کی تھیں۔ آرام دہ اور خوش گوار ماحول میں بیٹھ کر کام کرنا مجھے خود بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک فائلوں کے مطالعے میں غرق رہا۔ کمپیوٹر سے بھی چھیڑ چھاڑ کی لیکن طبیعت کی بشاشت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بارہ کے قریب میرے سامنے رکھا انٹر کام بجا اور اطلاع ملی کہ باس مجھے اپنے آفس میں یاد کر رہے ہیں۔ میں فوراً کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اپنے حلیے پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈال کر مطمئن ہونے کے بعد باس کے سامنے حاضری کے لیے روانہ ہو گیا۔ باس وہی صاحب تھے جنہوں نے مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کیا تھا اور جن کا چرایا ہوا جوتا میں اس وقت بھی پہنے ہوئے تھا۔ ان کے دائیں جانب قریباً انیس بیس سال کی ایک لڑکی جدید تراش خراش کا سوٹ پہنے بے نیاز بلکہ قدرے بیزار سی بیٹھی ہوئی تھی۔

''مسٹر کامران! ان سے ملیے، یہ ہیں ایچ ایچ بلڈرز کی اونر اور میری بھتیجی ہانیہ حسین۔'' مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد باس نے میرا لڑکی سے تعارف کروایا۔ تعارف نے مجھے چونکا دیا اور میں نے جلدی سے ہانیہ حسین کو سلام کیا۔ اس نے محض سر کی معمولی سی جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور پہلے کی طرح بے نیاز ہو گئی۔

''ہانیہ بی کام فائنل ائیر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ آگے اس کا ایم بی اے کرنے کا ارادہ ہے۔ اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے یہ آفس کو وقت نہیں دے پاتی اس لیے میں نے وقتی طور پر یہ ذمے داری سنبھال رکھی ہے۔'' باس فیصل رضا نے اس کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم کیں لیکن وہ یوں بیٹھی رہی جیسے اس کے بجائے کسی اور کا ذکر ہو رہا ہو۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں ملازم تھا اس کی طرح بے نیازی تو دکھا نہیں سکتا تھا اس لیے اخلاقاً یہ روایتی جملہ کہہ ڈالا جس کے جواب میں اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

''ہانیہ! یہ کامران احمد ہیں۔ میں نے انہیں اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کے لیے اپائنٹ کیا ہے اور انہوں نے آج ہی سے ہمیں جوائن کیا ہے۔'' باس صاحب اب تعارف کی باقی رسم نبھا رہے تھے۔

''گڈ!'' اس نے اپنے اسی بے نیاز انداز میں میری طرف دیکھ کر یہ واحد لفظ ادا کیا اور پھر نگاہوں کا رخ موڑ کر فیصل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ''او کے انکل، میں چلتی ہوں۔ مجھے کسی کام سے جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا تم جاؤ۔'' فیصل صاحب نے اسے جواب دیا۔ ویسے وہ ان کے جواب دینے سے قبل ہی اپنی سیٹ چھوڑ چکی تھی۔

''میرے بڑے بھائی عنایت حسین کی دو سال قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ان کی وائف ہانیہ کی پیدائش پر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ بھائی صاحب نے ہانیہ کی خاطر دوسری شادی نہیں کی اور بہت لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال گزر جانے کے باوجود یہ ابھی تک خود کو مکمل طور پر سنبھال نہیں سکی ہے اور اسی طرح لوگوں سے اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔'' فیصل صاحب نے یقیناً اس کے رویے کی وضاحت کے لیے مجھے یہ ساری تفصیل سنائی تھی۔ سن کر واقعی مجھے ہانیہ حسین سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

''بہت افسوس ہوا سر! میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اتنی عزیز ہستی کے اچانک بچھڑ جانے پر مس ہانیہ پر کیا گزری ہو گی۔'' میں نے اظہارِ افسوس کیا۔

''اسے دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ یہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے اس کے لیے خوشی کا سامان کروں۔'' فیصل صاحب کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں سر، وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ انسان کے سارے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ مس ہانیہ بھی آگے زندگی کی مصروفیات میں بہت کچھ بھول جائیں گی خاص طور پر شادی اور بچوں وغیرہ کی آمد سے بہت فرق پڑتا ہے۔'' میں نے بڑے خلوص سے ان کی اداسی دور کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں اور آج کل ہانیہ کے لیے کوئی اچھا لڑکا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' انہوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھا اور پھر موضوع بدل کر بولے۔ ''خیر، تم بتاؤ، آفس پسند

آیا؟‘‘

’’یس سر، بہت اچھا ہے۔‘‘ میں نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان اس حوالے سے مزید چند جملوں کا تبادلہ ہوا پھر انہوں نے مجھے اپنے آفس سے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد بھی آفس میں میرا سارا دن بہت اچھا گزرا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ کیشیئر نے چھٹی سے قبل مجھے ایڈوانس میں ہاف سیلری کا لفافہ تھما دیا۔ ظاہر ہے یہ بھی باس کی ہدایت کے مطابق تھا۔ شاید میری مالی حالت کا اندازہ ہونے کے سبب انہوں نے یہ مہربانی کی تھی۔ بہرحال میں بہت خوش تھا اس لیے چھٹی کے بعد گھر پہنچا تو بھی چہرے پر تازگی اور بشاشت تھی۔

’’بھائی تو اتنے فریش واپس آئے ہیں جیسے پکنک منا کر آرہے ہوں۔‘‘ نٹ کھٹ سی شمائلہ نے مجھے دیکھ کر بے ساختگی سے تبصرہ کیا۔

’’تمہارے بھائی کو جاب ہی اتنی شاندار ملی ہے کہ تھکن کا احساس ہی نہیں ہورہا۔‘‘ میں نے کالر جھاڑتے ہوئے ذرا شو ماری۔

’’ماشاء اللہ! اللہ نظرِ بد سے بچائے۔‘‘ امی نے فوراً کہا۔ مجھے خوش دیکھ کر وہ بھی خوش نظر آرہی تھیں۔ میں نے جا کر کپڑے وغیرہ تبدیل کیے پھر واپس امی کے پاس آیا تو چچا اور چچی بھی وہیں موجود تھے۔ دونوں میرے آفس میں گزرنے والے پہلے دن کے بارے میں سوال جواب کرنے لگے۔ اس دوران صدف بھی چائے کی ٹرے اٹھائے وہیں آگئی اور چہرے پر چمک لیے میری بتائی تفصیلات سنتی رہی۔

’’اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں اچھی جگہ ملازمت مل گئی ہے ورنہ آج کل تو ملازمت ملنے کے بعد ایڈجسٹمنٹ کا بھی بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ کہیں مالکان سخت گیر ہوتے ہیں تو کہیں اپنے ہی کولیگز جڑیں کاٹنے لگتے ہیں اور دونوں ہی صورتوں میں جاب جاری رکھنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ شکر ہے کہ یہاں تمہیں دونوں ہی طرح کے مسائل کا سامنا نہیں ہے۔‘‘ تفصیلات سن کر چچا نے تبصرہ کیا۔

’’جی بس آپ سب کی دعائیں ساتھ تھیں جو اللہ نے میرے لیے یہ بندوبست کر دیا۔‘‘ میں نے تابعداری سے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے بطورِ خاص صدف کی طرف دیکھا۔ میرے انٹرویو کے لیے جاتے ہوئے وہی سب سے زیادہ پُریقین تھی کہ میں کامیاب لوٹوں گا کیونکہ بقول اس کے اس نے بہت دعائیں کی تھیں۔

’’بزرگوں کا تو کام ہی دعا دینا ہے بیٹا بس آگے یہ تم لوگوں پر ہے کہ اپنے لیے کن راہوں کا انتخاب کرتے ہو۔ محنت اور ایمانداری کو ہمیشہ اپنا اصول بنائے رکھنا۔ انشاءاللہ ... بہت ترقی کرو گے۔‘‘ چچا نے مجھے نصیحت کی۔ ہر نوجوان کی طرح میں نصیحت سننے کا شوق بالکل نہیں رکھتا تھا لیکن چچا کے لحاظ میں فرنبرداری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ میری ایک ایک رگ سے واقف صدف اس صورتِ حال سے محظوظ ہوتی مسکراتے لبوں سے چائے کی پیالیاں سمیٹ کر ٹرے میں رکھنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گئی۔

’’ارے ہاں یاد آیا چچی۔ وہ عاشقہ کے رشتے کا کیا ہوا؟ ان لوگوں نے دوبارہ کوئی رابطہ وغیرہ کیا۔‘‘ چچا کی گفتگو میں وقفہ آیا تو میں نے موضوعِ گفتگو بدلنے کے خیال سے چچی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں فون آیا تو تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا جواب دیں۔‘‘ چچی نے آہستہ سے جواب دیا۔

’’کیا مطلب! لڑکے کا بائیو ڈیٹا تو بڑا اچھا تھا اور آپ کے مطابق لوگ بھی بہت اچھے ہیں پھر یہ تذبذب کیسا؟ اگر لڑکے اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کسی قسم کی چھان بین کروانی ہو تو اس کے لیے میں حاضر ہوں۔‘‘ میرے لیے ان کا جواب خاصا مبہم تھا اس لیے میں نے ذرا وضاحت چاہی۔

’’چھان بین کا تو اتنا خاص مسئلہ نہیں ہے بیٹا۔ وہ لوگ میری بہن کے سسرالی رشتے داروں میں ہی سے ہیں اور میرے بہنوئی ان کی ہر طرح کی ضمانت لینے کے لیے تیار ہیں۔ خود میں بھی ان لوگوں سے واقف ہوں لیکن انہوں نے مطالبہ ہی ایسا کیا ہے کہ میں اور تمہارے چچا شش و پنج میں پڑ گئے ہیں۔‘‘ چچی نے وضاحت بھی کی تو ایسی کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ امی بھی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

’’کیسا مطالبہ؟ کہیں انہوں نے جہیز میں کسی قیمتی چیز کی فرمائش تو نہیں کر دی۔ اگر ایسا ہے تو صاف انکار کر دیں۔ لالچی لوگوں کے منہ ساری زندگی بند نہیں ہوتے۔‘‘ میں نے خود ہی اندازہ قائم کرتے ہوئے مشورے سے بھی نوازا۔

’’ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسے اوچھے لوگ نہیں ہیں وہ۔ ان کے پاس تو خود اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ انہیں اگر جہیز وغیرہ کا لالچ ہوتا تو ہمارے جیسے سفید پوش گھرانے کا رخ ہی کیوں کرتے۔ ان کی تو کوئی اور ہی خواہش ہے۔‘‘

''آخر کیا خواہش ہے ان کی؟ تم پہیلیاں بجھوانے کے بجائے سیدھے سیدھے بتا ہی ڈالو۔'' اس بار امی نے چچی کے مبہم جوابوں سے جھنجلا کر دوٹوک پوچھا تو وہ ذرا جھینپ گئیں پھر چچا کو اشارہ کیا۔ ان کے اشارے پر چچا کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے قدرے پست آواز میں بولے۔

''بات یہ ہے بھابی جان کہ وہ ہمارے گھر رشتہ کرنے کے خواہش مند تو ہیں لیکن انہیں عاشفہ سے زیادہ صدف بھا گئی ہے۔ بڑی ہونے کی وجہ سے اصولاً پہلا حق ہے بھی صدف کا لیکن ہم اماں کی کہی بات کے لحاظ میں اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں نے تو اس بار بھی ساجدہ سے کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کو صاف بتادو کہ صدف اپنی تائی کی بہو بنے گی لیکن یہ ذرا سوچ بچار میں پڑ گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اماں نے جو بات کہی تھی جانے اسے آپ لوگوں نے سیریس لیا بھی تھا یا نہیں۔ بچپن کی بات الگ ہوتی ہے، بڑے ہونے کے بعد بچے مختلف طبیعتوں کے نکلتے ہیں۔ اللہ جانے آپ کو ہماری صدف بہو کی حیثیت سے قبول بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ کامران میاں کو بھی کوئی اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے صدف ان کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو یا کسی بھی اور وجہ سے یہ اس رشتے کو جوڑنے میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں تو صدف بے چاری کو خوامخواہ انتظار میں لٹکانے کا کیا فائدہ ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ ہم اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکالنے کے بجائے پہلے کھل کر آپ سے بات کرلیں۔'' چچا نے ساری بات کھول کر سامنے رکھ دی تو ہم پر صورتِ حال واضح ہوئی۔ امی نے سکون سے ساری بات سنی اور پھر اطمینان سے بولیں۔

''اماں نے صدف کو کامران سے منسوب کرنے کا جو فیصلہ سنایا تھا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہا لیکن کبھی تجدید اسی خوف سے نہ کی کہ نامعلوم بڑے ہونے کے بعد بچوں کا کیا رجحان ہو۔ جہاں تک میری پسند کی بات ہے مجھے صدف دل وجان سے قبول ہے۔ اسے اپنی بہو بنا کر مجھے بہت اچھا لگے گا البتہ کامران کی رائے میں ابھی آپ کے سامنے ہی معلوم کرلیتی ہوں۔ کیوں کامران...... تم کیا کہتے ہو؟''

امی اچانک مجھ سے مخاطب ہوئیں تو میں تھوڑا سا گڑبڑا گیا لیکن انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صدف کو میں ہمیشہ سے خاص حوالے سے ہی دیکھتا آیا تھا اور اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ وہ میرے دل پر قابض تھی۔ بہرحال چچا کے سامنے قلبی کیفیت تو کھل کر بیان نہیں کی جاسکتی تھی اس لیے نہایت برخوردارانہ انداز میں بولا۔ ''جیسی آپ بزرگوں کی مرضی۔ آپ لوگوں نے سوچ سمجھ کر ہماری بہتری کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔''

''جیتے رہو بیٹا، تم نے میرا مان رکھ لیا۔ تم میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہو اور کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں مجھے تمہیں اپنا داماد بنا کر زیادہ خوشی ہوگی۔'' دل گیر لہجے میں بولتے ہوئے چچا نے اپنے بازو وا کیے تو میں فوراً ان کی چھاتی سے جالگا۔ ہم دونوں ہی کی گرفت میں خاصا جوش تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ میں ان کے سینے سے لگا ابا کی شفقت کو یاد کررہا تھا تو وہ بھی مجھ سے اپنے بیٹے کی محرومی کو مٹانے کی کوشش کررہے تھے۔

''اب تو تمہیں کوئی الجھن نہیں ہے نا ساجدہ۔ اب صدف بیٹی کی طرف سے بےفکر ہوجاؤ۔ کامران اپنی جاب پر اچھی طرح سیٹ ہوجائے تو میں باقاعدہ خاندان میں مٹھائی تقسیم کرواکر اس رشتے کا اعلان کردوں گی۔'' امی، چچی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ سب کہہ رہی تھیں اور میری نظریں دروازے پر منڈلا رہی تھیں۔ مجھے وہاں صدف کے دھانی آنچل کی جھلک نظر آئی جس کا مطلب تھا کہ کمرے میں ہونے والی گفتگو سے وہ بھی واقف ہوگئی ہے۔ اس کی دلی کیفیت کا تصور کرکے میرے ہونٹ خودبخود مسکرا اٹھے۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے ہفتہ ہو چلا تھا۔ خوش گوار ماحول اور کولیگز کے تعاون نے مجھے بہت جلد وہاں ایڈجسٹ کردیا تھا۔ میں بھی محنت سے اور دل لگا کر وہاں کام کررہا تھا۔ فیصل صاحب کا سلوک بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ روزانہ کم ازکم ایک بار میری ان سے ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ پیشہ ورانہ امور پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے دیگر موضوعات پر بھی ہلکی پھلکی گفتگو کرلیا کرتے تھے۔ اس گفتگو کے نتیجے میں جہاں انہیں میرے حالات سے اچھی طرح واقفیت ہوگئی تھی وہیں مجھے بھی بہت کچھ جاننے کا موقع ملا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ اس کمپنی میں ان کے صرف دس فیصد شیئرز ہیں جبکہ باقی شیئرز کے مالک ان کے مرحوم بھائی عنایت حسین تھے۔ اصل میں دونوں بھائیوں کا شمار چھوٹے کاروباری افراد میں ہوتا تھا لیکن خوش قسمتی سے عنایت صاحب ہانیہ کی والدہ صوفیہ کو بھا گئے۔ صوفیہ کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے

اس لیے جہیز میں وہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر آئیں۔ یہ دولت اتنی تھی کہ عنایت حسین چاہتے تو اپنا علیحدہ کاروبار سیٹ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے چھوٹے بھائی کو خود سے الگ کرنا پسند نہیں کیا۔ یوں دونوں بھائی واضح فرق کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ فیصل کو اندازہ تھا کہ بھائی کے ساتھ جڑے رہنے میں انہیں جو فائدہ ہے وہ اپنے الگ کاروبار سے ہرگز نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ ساری زندگی بھائی کے احسان مند رہے اور اب ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کمپنی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی بھتیجی ہانیہ حسین سے بھی بہت زیادہ محبت کا دعویٰ تھا اور میرے سامنے متعدد بار انہوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ جوں ہی ہانیہ کے لیے کوئی معقول لڑکا نظر آیا وہ اس کی شادی میں تاخیر نہیں کریں گے۔ معقول لڑکے کے لیے ان کا کیا معیار تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا کیونکہ جہاں تک میرا اندازہ تھا ہانیہ جیسی دولت مند لڑکی سے شادی کے خواہش مند بہت ہوں گے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ بہت دولت مند تھی۔ شکل صورت کی بھی بری نہیں تھی اگر کوئی کمی تھی بھی تو وہ پہننے اوڑھنے کے سلیقے سے پوری ہو جاتی تھی۔ دولت یوں بھی انسان کے بہت سے عیب چھپا لیتی ہے۔ میں نے اس ایک ہفتے کے دوران اسے صرف دو بار وہاں دیکھا تھا۔ کچھ بے نیاز سی لڑکی تھی۔ آس پاس موجود لوگوں پر نظر بھی نہیں ڈالتی تھی بلکہ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا بس اپنے آپ میں ہی مگن رہتی ہے۔ خیر مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔ میں خوش تھا کہ ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے جس میں معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ بہت سی دیگر مراعات بھی حاصل ہیں۔ چھٹی بھی ہفتہ اتوار دو دن کی ہوتی تھی۔

یہ جمعے والے دن کا ذکر ہے میں اپنے کیبن میں بیٹھا تن دہی سے کام نمٹانے میں مصروف تھا۔ آفس ٹائم ختم ہونے والا تھا اس لیے میری خواہش تھی کہ جلد از جلد کام مکمل کرلوں لیکن اس سے قبل ہی فیصل صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بلوا لیا۔ ہانیہ بھی وہیں موجود تھی۔ میں نے اسے سلام کیا جس کا اس نے سر کی معمولی جنبش سے جواب دیا۔

''آؤ بھئی کامران، اصل میں اس وقت میں نے تمہیں ایک ذاتی کام سے زحمت دی ہے۔ امید ہے تم مائنڈ نہیں کرو گے۔'' فیصل صاحب کا رویہ اپنی بھتیجی کے مقابلے میں میرے ساتھ ہمیشہ پُرجوش ہوتا تھا۔

''زحمت کی کیا بات ہے سر آپ حکم کریں۔'' میں نے بھی فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

''تمہیں ہانیہ کے ساتھ گھر تک جانا ہوگا۔ اصل میں آج اس کا ڈرائیور چھٹی پر ہے اور یہ خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں آگئی ہے۔ اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اب یہ اکیلی واپس جائے۔ تمہیں ہانیہ کے ساتھ گھر جانا ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔

''اوکے سر! نو پرابلم میں چلا جاتا ہوں۔'' جواباً میں نے بھی مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

''جاؤ بھئی ہانیہ، اب میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ کامران تمہارے ساتھ ہوگا تو مجھے فکر نہیں رہے گی۔'' اس بار فیصل صاحب کی مخاطب ہانیہ حسین تھی جو اُن کی بات سنتے ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور سپاٹ چہرے کے ساتھ فوری دروازے کی طرف بھی بڑھ گئی۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے ہولیا۔ گاڑی پاس نہ ہونے کے باوجود میں اپنے دوستوں کی بدولت ڈرائیونگ جانتا تھا اور پُراعتماد تھا کہ آسانی سے ہانیہ حسین کی گاڑی کو ڈرائیو کرلوں گا لیکن اس نے مجھے موقع نہیں دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد مجھے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس صورت حال پر میں تھوڑا سا جز بز تو ہوا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں مجھے پچھلی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے چچا کی خواہش پر مجھے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے ورنہ قطعاً ایسا نہ کرتی۔ مجبور میں بھی تھا چنانچہ سفر جاری رہا۔ ابھی کوئی سات آٹھ منٹ ہی گزرے تھے کہ ہانیہ نے ایک سائیڈ پر کر کے گاڑی روکی اور دونوں ہاتھوں سے یوں سر تھام کر بیٹھ گئی جیسے اسے چکر آرہے ہوں۔

''آر یو اوکے میم!'' میں نے ذرا تشویش سے اس سے پوچھا لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں پریشان ہو کر گاڑی سے اتر گیا اور ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی سے جھانک کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ موسم اگرچہ گرم تھا لیکن گاڑی میں چلتے اے سی کی موجودگی میں اس کی یہ حالت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے بند شیشے کو انگلیوں سے بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے فوراً ہی لاک کھول دیا۔

''آر یو اوکے میڈم!'' وہ لاک کھول کر گاڑی سے

باہر نکلنے لگی تو میں نے اس سے ایک بار پھر دریافت کیا۔
''میں ڈرائیو نہیں کرسکوں گی تم گاڑی چلاؤ۔'' اس نے ذرا ڈوبی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔
''کیا آپ کو کسی ہاسپٹل لے چلوں؟'' گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ وہ پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بالکل نڈھال بیٹھی ہوئی تھی اس لیے میں نے یہ سوال کرنا ضروری سمجھا۔
''نہیں سیدھے گھر لے چلو۔'' اس نے انکار کردیا تو مجھے بھی اپنی مرضی چلانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی رہائش گاہ کے بارے میں مجھے علم تھا کہ کس علاقے میں ہے۔ متمول لوگوں کے اس رہائشی علاقے میں پہنچنے کے بعد اپنی کوٹھی تک ہانیہ نے خود مجھے گائیڈ کردیا۔ اب وہ سنبھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کوٹھی پر پہنچنے کے بعد اس نے مجھے واپسی کی اجازت دے دی۔ میں کچھ کنفیوز سا وہاں سے چل پڑا۔ آفس ٹائم ختم ہوچکا تھا لیکن میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لوٹ کر آفس جاؤں یا سیدھا گھر چلا جاؤں۔ اوپر سے یہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ کسی سواری کے ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سواری کے لیے مجھے خاصا چل کر روڈ تک جانا پڑتا۔ مرتا کیا نہ کرتا چلتا رہا۔ اس دوران ہی میں نے فیصل صاحب کو کال کر کے صورتِ حال سے باخبر کردیا۔
''ہانیہ کا بی پی اکثر لو ہوجاتا ہے اسی لیے میں اسے اکیلے گاڑی لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اسے گھر تک پہنچا دیا۔ اب گھر والے خود ہی اسے دیکھ لیں گے۔'' میری دی گئی رپورٹ کے جواب میں فیصل صاحب نے کہا تو میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
''میرے لیے کیا حکم ہے سر۔ واپس آفس پہنچوں یا گھر چلا جاؤں!''
''آفس ٹائم تو ختم ہوگیا ہے یار، تم یہاں آکر کیا کرو گے؟ میں بھی اب نکلنے ہی والا ہوں۔ ایک پارٹی کے ساتھ سائیڈ پر جانا ہے۔ تم بھی اب اپنے گھر چلے جاؤ۔'' انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا تو میں ہلکا پھلکا ہوگیا۔ مین روڈ تک کا اچھا خاصا راستہ پیدل طے کرنے کے بعد میں ابھی اسٹاپ پر پہنچا ہی تھا کہ میرے موبائل پر کال آنے لگی۔ نمبر اس موبائل کا تھا جو عموماً میرے چھوٹے بھائی جبران کے استعمال میں رہتا تھا۔ جبران کے اس وقت کال کرنے سے میں کچھ الجھن میں مبتلا ہوگیا۔
''آپ کہاں ہیں بھائی!'' میری ''ہیلو'' کے جواب میں جبران نے جس انداز میں مجھ سے یہ سوال کیا، میرا ماتھا ٹھنک گیا۔
''خیریت تو ہے جبران؟'' میں نے شدید تشویش سے پوچھا۔
''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم انہیں اسپتال لے کر آگئے ہیں۔ آپ بھی سیدھے یہیں آجائیں۔'' اس نے مجھے اسپتال کا نام بتایا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ظاہر ہے وہ ابھی خاصا کم عمر تھا اور اس صورتِ حال پر گھبرا گیا تھا۔
''تم پریشان مت ہو۔ میں بس آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں۔'' اسے تسلی دے کر میں نے کال منقطع کی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا اپنا دل قابو میں نہیں ہے لیکن پھر ہمت کر کے خود کو سنبھالا اور ایک رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

چھٹی کے دو دن جس اذیت میں گزرے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ماں جیسی ہستی کو تکلیف میں دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ میری ماں بھی شدید تکلیف میں مبتلا تھیں اور میں ان کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کا مرض ایک بار پھر پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا نہیں لیکن میں خود ہی سمجھ گیا کہ امی کو تکلیف کئی دن سے تھی لیکن انہوں نے اپنی تکلیف سب سے چھپائے رکھی۔ انہیں خیال ہوگا کہ ان کی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کل جمع پونجی ختم ہوگئی ہے اس لیے انہوں نے پوری کوشش کی کہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ ہونے پائے لیکن انسان کی برداشت کی بھی ایک حد ہی ہوتی ہے۔ وہ حد ختم ہوگئی تو امی اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئیں اور گھر والے گھبرا کر انہیں اسپتال لے آئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ امی کا علاج جلد از جلد شروع کروانے کی ضرورت تھی لیکن میں بالکل خالی ہاتھ تھا جو چند ہزار پاس تھے وہ بھی ان دو دنوں میں خرچ ہوگئے تھے۔ ایسی پریشانی تھی جس کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قرض ادھار مانگنے نکلتا تو کس سے اور کہاں تک مانگتا۔ علاج کے لیے لاکھوں درکار تھے۔ ملازمت بھی نئی نئی تھی۔ ہم قیمتی زیورات یا کسی جائداد کے بھی مالک نہیں تھے کہ اسے بیچ کر امی کا علاج کروالیتے۔ لے دے کر ایک گھر ہی تھا جو ہماری اور چچا کی مشترکہ ملکیت تھی۔ امی کی خاطر میں بے گھر ہونا بھی قبول کرلیتا لیکن چچا کے سر سے چھت چھیننے کا حوصلہ نہیں

تھا۔ گھر بیچنے کی صورت میں وہ اپنے حصے کی آدھی رقم سے کوئی دوسرا معقول مکان نہیں خرید سکتے تھے اور اپنی مجبوری میں انہیں تین جوان بیٹیوں کے ساتھ دربدر ہونے پر مجبور کرنا قطعی غیر اخلاقی عمل تھا۔ اس طرح کے خیالات میں ڈوبا میں بستر پر کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ مغرب کے بعد چچا نے اسپتال پہنچ کر مجھے زبردستی گھر بھیج دیا کہ ...تم رات گھر میں گزار کر آرام کرلو تاکہ صبح آفس جاسکو۔ میرا آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا لیکن اتنی تنگ و دو کے بعد ملنے والی ملازمت کی طرف سے بے پروائی برتنا بھی حماقت ہوتی اس لیے میں ان کے حکم پر گھر چلا آیا لیکن دل کو قرار نہیں تھا تو نیند کیسے آنکھوں میں اترتی بس یونہی بستر پر پڑا رہا۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ صدف دودھ کا گلاس لے کر آگئی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا واپس لے جاؤ۔'' میں نے قدرے روکھے لہجے میں اس سے کہا۔

''پلیز پی لیجیے آپ نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا ہے۔ اس طرح تو آپ بیمار ہوجائیں گے۔'' میرے روکھے پن کے جواب میں وہ نہایت ملائمت سے بولی۔

''میری بھوک پیاس اڑگئی ہے صدف۔ میں کھانے پینے کی کوئی چیز اپنے منہ کی طرف لے جانے لگوں تو امی کا خیال آجاتا ہے اور مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔'' اس بار میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''تائی امی کی تکلیف کا احساس ہم سب کو ہے کامی لیکن ان مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے ہمیں حوصلہ تو کرنا ہوگا۔ آپ کو بھی ان حالات میں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ چلیں شاباش یہ دودھ پی لیں پھر ہم غور کریں گے کہ کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے کچھ ایسے انداز میں اصرار کیا کہ میں انکار نہیں کرسکا۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کامی لیکن پہلے وعدہ کریں کہ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ تمہیں اس طرح تمہید باندھنی پڑ رہی ہے۔ میں تو ہمیشہ سے تمہاری بات کو اہمیت دیتا آیا ہوں۔''

''میں جو کچھ کہنے آئی ہوں وہ اس مان کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ بیماری، خوشیاں اور غم سب مشترک ہیں اور ہمیں حق ہے کہ ہر طرح کے حالات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ کیا آپ میرا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کامی؟''

''کیوں نہیں صدف۔ میرے لیے بھلا تم سے بڑھ کر کون اپنا ہے۔ میں اپنی ذات پر تمہارا ہر حق تسلیم کرتا ہوں۔''

''تو اس حق سے ہی آپ مجھے اجازت دیں کہ میں تائی امی کے علاج کے لیے کچھ چیزیں آپ کے حوالے کرسکوں۔'' اس نے یکدم ہی ایک پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔

''کیا ہے اس میں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''آپ خود ہی دیکھ لیں۔'' اس نے کہا تو میں نے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ اندر پانچ سو، ہزار اور سو کے نوٹوں پر مشتمل ایک گڈی، دو عدد سونے کی چوڑیاں اور سیٹ موجود تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے قدرے متوحش ہو کر پوچھا۔

''میری جمع پونجی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے تائی امی کے علاج پر خرچ کریں۔'' اس بار اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟ میں تمہاری اتنی محنت سے جوڑی ہوئی چیزیں کیسے لے سکتا ہوں؟'' میں نے قدرے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے پوٹلی کو دوبارہ باندھنا شروع کردیا۔ میرے علم میں تھا کہ صدف نے یہ رقم اور زیور کتنی جدوجہد کے بعد جوڑے ہیں۔ وہ شروع سے ایک قناعت پسند اور محنتی لڑکی تھی۔ میں نے بچپن سے آج تک اسے کبھی روپے ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ملنے والی عیدی اور اچھے رزلٹ پر دی جانے والی انعامی رقم بھی جمع کرنے کی عادی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کردی تھی بعد میں گھر کے قریب ہی موجود ایک پرائیوٹ اسکول بھی جوائن کرلیا۔ صدف سلائی کڑھائی کے ہنر میں بھی ماہر تھی اور لوگوں کی فرمائش پر یہ کام بھی اجرت کے عوض کردیا کرتی تھی اس لیے مناسب رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ اس رقم سے ہی چچی نے اسے یہ زیورات بنوا کردیے تھے۔

''آپ مجھ سے وعدہ کرچکے ہیں کامی کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔'' اس نے فوراً مجھے ٹوکا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم یہ سب کرنے والی ہو۔ ان چیزوں کو سنبھال کر رکھو۔ یہ چچی نے تمہارے جہیز کے لیے رکھی ہوں گی۔'' میں نے پوٹلی واپس اس کی طرف بڑھائی۔

''جہیز کا کیا مسئلہ ہے؟ مجھے کون سا بیاہ کر کہیں اور جانا ہے۔ کیا آپ بغیر جہیز کے مجھے قبول نہیں کریں گے؟'' اس

نے کچھ ایسی معصومیت سے پوچھا کہ مجھے اس پر بے تحاشا پیار آ گیا۔

''تم تو مجھے ہر حال میں دل و جان سے قبول ہو صدف۔ تم جیسی لڑکی کو قبول کرنے سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہوگا لیکن ان چیزوں کو لینے کے لیے میرا دل راضی نہیں ہوتا۔ تمہارا خلوص اور جذبہ دونوں انمول ہیں لیکن ذرا سوچو کہ میں تمہیں ان چیزوں سے محروم بھی کر دوں تو کیا فائدہ ہوگا۔ اس رقم سے امی کا مکمل علاج تو پھر بھی ممکن نہیں ہے نا۔'' اس بار میں نے اسے ذرا رسان سے سمجھایا۔

''مجھے معلوم ہے کہ علاج کے لیے اس سے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی لیکن اس کی مدد سے فی الحال آغاز تو کیا جا سکتا ہے۔ آگے کے لیے بھی میں نے کچھ سوچ لیا ہے۔'' وہ جیسے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''کیا سوچ لیا ہے تم نے؟'' اس بار میں نے قدرے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''میں ابو سے بات کروں گی کہ یہ مکان سیل کر دیں۔ ہم لوگ کرائے کے گھر میں بھی رہ سکتے ہیں۔ فی الحال تائی امی کا علاج سب سے زیادہ اہم ہے۔'' اس نے اپنے ارادے ظاہر کیے تو میں اچھل پڑا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ چچا اور چچی کیا سوچیں گے۔ چچی کے دل میں تو یقیناً یہی خیال آئے گا کہ تمہیں یہ پٹی میں نے پڑھائی ہے۔ میری محبت میں اس حد تک مت جاؤ صدف کہ میں رسوا ہو جاؤں۔ اگر تمہارے کہنے پر چچا راضی بھی ہو گئے تو اتنے لوگوں کو بے چھت کرنے کا بوجھ میں نہیں سہار سکوں گا۔ امی کو بھی شاید یہ بات منظور نہ ہو کہ ابو اور چچا کی محنت سے بنایا گیا یہ گھر بیچ دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے میں نے مان لیا کہ آپ کی ساری باتیں درست ہیں لیکن یہ بتائیں کہ پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ کیا ہم تائی امی کو بغیر علاج کے چھوڑ سکتے ہیں؟'' اس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ میں ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے سے اپنا سر تھامے بیٹھا رہ گیا۔ واقعی حل تو کوئی نہیں تھا میرے پاس۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کامران آج تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو؟'' اگلے روز آفس پہنچ کر بھی میرا ذہن امی میں ہی الجھا ہوا تھا اور یقیناً یہ الجھن میرے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔ جب میں فیصل صاحب کی کال پر ان کے آفس پہنچا تو انہوں نے دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد ہی مجھ سے یہ سوال کر ڈالا۔

مجھ میں مزید ضبط کا یارا نہیں تھا سو انہیں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''تمہیں چاہیے تھا کہ مجھ سے رابطہ کرتے۔ خوامخواہ دو دن تک پریشان ہوتے رہے۔'' تفصیل سن کر انہوں نے جو جملہ کہا اس نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ اچھے تھے لیکن مجھے ان سے اس حد تک غم گساری کی امید نہیں تھی۔

''حیران کیوں ہو رہے ہو بھئی۔ تمہارا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم پریشان رہو یہ کچھ اچھا تو نہیں لگتا۔'' انہوں نے ایک بار پھر میری حیرت میں اضافہ کیا۔

''تھینک یو سو مچ سر کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا لیکن میں اپنی ایک ہفتے کی ملازمت میں یہ ہمت کیسے کر سکتا تھا کہ آپ سے کوئی مطالبہ کرتا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ اس ایک ہفتے کے دوران ہی تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ تمہارا یہاں ایک خاص مقام ہے اور میں تمہیں دیگر اسٹاف کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''یہ تو آپ کی مہربانی ہے سر، ورنہ میں کس قابل ہوں۔'' میرے لہجے میں حقیقی انکساری تھی۔

''تم قابل ہو اسی لیے تمہیں اتنی اہمیت دی جاتی ہے لیکن قابلیت سے مراد تمہاری پیشہ ورانہ قابلیت نہیں ہے۔ اس روز انٹرویو کے لیے جو لوگ یہاں آئے تھے ان میں سے کچھ اکیڈمک ریکارڈ اور تجربے کے اعتبار سے تم سے زیادہ لائق تھے لیکن میں نے تمہارا انتخاب صرف تمہاری راست گوئی اور ایمان داری کو دیکھتے ہوئے کیا تھا۔ تمہارے پیروں میں موجود جوتوں کے بارے میں سوال کرتے ہوئے مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ تم اتنی سچائی سے کام لو گے۔ تم نے سچ بولا تو مجھے بہت اچھا لگا اور محسوس ہوا کہ تم وہی نوجوان ہو جس کی مجھے تلاش ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اپنے آفس میں تمہیں ملازمت دینے کا مقصد محض تمہیں مزید جانچنا تھا ورنہ حقیقتاً پہلی ہی ملاقات میں ...... میں نے تمہیں اپنی پیاری بھتیجی ہانیہ حسین کے لیے منتخب کر لیا تھا۔'' انہوں نے گویا میرے سر پر کوئی بم پھاڑا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟'' میں بوکھلا سا گیا۔

''غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہانیہ مجھے بہت عزیز ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ساتھی ایسے شخص کو بناؤں جو ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھ سکے۔ تم میں مجھے ایسی خوبیاں نظر آئی ہیں کہ مجھے پورا یقین ہے ہانیہ تمہارے ساتھ خوش

رہے گی۔''

''لیکن میں تو کسی بھی طرح مس ہانیہ کے لائق نہیں ہوں سر۔ انہیں اپنی کلاس میں مجھ سے بہت بہتر شخص بھی مل سکتا ہے۔'' بیٹھے بٹھائے ایک نہایت امیر لڑکی کا پروپوزل میرے سامنے رکھ دیا گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے۔ میں تو ہمیشہ سے صرف صدف کو اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب دیکھتا رہا تھا اور یہاں مجھے ہانیہ جیسی لڑکی سے شادی کی پیشکش کی جارہی تھی۔

''تمہاری بات ایک حد تک ٹھیک ہے۔ بزنس کمیونٹی میں ہی سے کئی لوگ ایسے ہیں جو ہانیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی نظریں ہانیہ سے زیادہ اس کی دولت پر ہیں۔ دولت کی تو چلو کوئی بات نہیں، وہ جس سے بھی شادی کرے گی اس کی دولت اسے ہی ملے گی لیکن یہ جو ہماری کلاس کے لڑکے ہیں نا ان میں سے مشکل ہی سے کوئی ملے گا جو اتنا کیئرنگ ہو کہ ہانیہ کو سنبھال سکے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ بھائی صاحب کی ڈیتھ کے بعد ہانیہ مینٹلی بہت ڈسٹرب ہوگئی ہے۔ اسے بہت زیادہ خیال اور توجہ کی ضرورت ہے اور مجھے اپنی کمیونٹی کے کسی لڑکے سے اتنی زیادہ امید نہیں ہے۔ جو خود ناز و نعم اور نخروں میں پلے بڑھے ہوں وہ دوسروں کے نخرے اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ کام وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے زندگی کی سختیاں اور مسائل دیکھے ہوں اور جنہیں معلوم ہو کہ رشتے نبھانے کے لیے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔'' انہوں نے الفاظ کا انتخاب بہت اچھا کیا تھا اور لہجہ بھی شائستہ تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی لاڈلی بھتیجی کے لیے شوہر کی صورت ایک زرخرید غلام کے خواہش مند ہیں جو اس کے آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر گھوم سکے۔ اس مقصد کے لیے مجھ سے اچھا انتخاب بھلا کیا ہوسکتا تھا۔ میرے معاشی اور گھریلو مسائل ان کے سامنے تھے۔ میں تعلیم یافتہ اور اسمارٹ بھی تھا چنانچہ وہ آسانی سے مجھے اپنے حلقے میں شامل کرسکتے تھے۔

''کس سوچ میں ہو کامران؟ میں نے تمہیں ایک نہایت مناسب آفر کی ہے اور بہت صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ تم ہانیہ کے لیے مجھے پسند ہو۔ میرے خیال میں تو یہ ایک اچھا پروپوزل ہے۔ ہانیہ ایک قبول صورت، کم عمر اور دولت مند لڑکی ہے جس کے زندگی میں شامل ہونے سے تم اپنے بہت سے مسائل بہ آسانی حل کرسکو گے۔ تمہاری والدہ کا علاج ہوگا۔ چھوٹا بھائی اور بہن اچھی تعلیم حاصل کرکے اپنی لائف میں سیٹل ہوسکیں گے۔ تم خود عیش و آرام کی زندگی گزارو گے اور اس سے بڑھ کر بھلا تمہیں کیا چاہیے۔ ہر شخص زندگی میں بس یہی خواہشات تو رکھتا ہے۔'' مجھے خاموش پاکر انہوں نے ایک بار پھر سمجھانے کا سلسلہ شروع کردیا۔

''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے سر۔'' آخر کار میں نے حوصلہ کرکے ان سے کہہ ڈالا۔

''وائے ناٹ! تم جتنی چاہے مہلت لے لو لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ تم فیصلہ کرنے میں جتنی دیر کرو گے تمہاری والدہ کی تکلیف میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ وقت کی اہمیت مجھ سے زیادہ تمہارے پیش نظر ہونی چاہیے۔'' بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے ادا کرکے انہوں نے گویا گفتگو کا اختتام کردیا۔ میں ان سے اجازت لے کر اپنے کیبن میں واپس آگیا۔ آفس میں پورا دن اسی ادھیڑبن میں گزرا کہ کیا فیصلہ کروں۔ میرے کولیگز کو بھی امی کی طبیعت کے بارے میں علم ہوگیا تھا چنانچہ وہ میرے چہرے پر چھائی پریشانی کو دیکھ کر مجھے تسلی و تشفی دیتے رہے۔ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد میں سیدھا اسپتال پہنچ گیا۔ امی کی حالت ہنوز خراب تھی اور ڈاکٹرز کا یہی کہنا تھا کہ جلد از جلد ان کا ٹریٹمنٹ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ میں کئی گھنٹے اسپتال میں گزار کر گھر واپس لوٹا تب بھی الجھا ہوا تھا البتہ ذہن بار بار یہ مشورہ دینے لگا کہ مجھے فیصل صاحب کی پیشکش قبول کرکے اپنے جملہ مسائل کو حل کرنے کا سامان کرلینا چاہیے۔ دماغ کے اس مشورے کو حتمی فیصلے کی شکل دینے میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ صدف کی ذات تھی۔ میرے راہ بدل لینے سے اس پر قیامت ٹوٹ جاتی۔ وہ کتنا چاہتی تھی مجھے۔ اس سے میری تکلیف اور پریشانی نہیں دیکھی گئی تھی جب ہی تو کل رات اپنی عمر بھر کی پونجی میرے سپرد کرگئی تھی لیکن کیا ستم تھا کہ اس بہت محبت سے مالا مال لڑکی کی عمر بھر کی بچت ہانیہ حسین کی دولت کے سمندر کے سامنے ایک بوند جیسی حیثیت رکھتی تھی۔ صدف میرے دکھوں پر میرے ساتھ دکھی ہوسکتی تھی لیکن اس کے پاس ہانیہ حسین کی طرح بے تحاشا دولت کی وہ طاقت نہیں تھی جو بہت سے مسائل چٹکی بجاتے حل کردیتی ہے۔ اسپتال سے گھر آکر بھی میں تقریباً ساری رات جاگتا رہا اور جب کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکا تو فجر کے بعد چچا جان کے سامنے جا بیٹھا۔ انہیں میں نے بلاکم و کاست فیصل صاحب کی پیشکش کے بارے میں سب بتا ڈالا۔ سن کر وہ بھی گنگ

رہ گئے۔

''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کوئی فیصلہ ہی تو نہیں کر پا رہا ہوں چچا جان۔ فیصل صاحب کی آفر قبول کرتا ہوں تو سارے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں لیکن فوراً ہی اس کمٹمنٹ کا خیال آجاتا ہے جو میرے اور صدف کے حوالے سے آپ بزرگوں کے درمیان ہو چکی ہے۔ یہ کمٹمنٹ ٹوٹی تو یقیناً سب کو بہت دکھ ہوگا۔'' میں نے پیشانی مسلتے ہوئے ان کے سامنے اپنی الجھن بیان کی۔

''تم اس حوالے سے بے فکر رہو کامران میاں۔ صدف میری بیٹی ہے، وہ بہت صابر اور ایثار پسند طبیعت کی مالک ہے۔ کل دوپہر ہی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تائی امی کے علاج کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے لیے ہمیں یہ مکان فروخت کر دینا چاہیے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اس تجویز پر غور کروں گا۔'' چچا بہت حوصلے سے بات کر رہے تھے پھر بھی مجھے اندازہ تھا کہ ان کے دل کو صدمہ ہوا ہے۔

''صدف نے اس بات کا ذکر میرے سامنے بھی کیا تھا لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ مکان بیچ کر سب لوگ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ کرائے کے گھروں میں رہنا کوئی اتنا آسان نہیں ہوتا۔ سر پر چھت اپنی ہو تو آدمی روکھی سوکھی بھی کھا کر گزارہ کر لیتا ہے لیکن ہر مہینے ایک بڑی رقم کرائے میں دینا مشکل ہوگا۔ آپ کی ریٹائرمنٹ میں چند سال ہی باقی ہیں۔ آپ کے سر پر تین بیٹیوں کی شادی کی ذمّے داری ہے۔ ایسے میں آپ کہاں کرائے کے گھروں میں خوار ہوتے پھریں گے۔ ہماری طرف کے حالات بھی سب کو معلوم ہے کہ کتنے مخدوش ہیں۔ امی کے علاج کے لیے کتنی مدت اور رقم درکار ہوگی کچھ اندازہ نہیں ہے۔ جبران اور شمائلہ کی تعلیم ابھی جاری ہے۔ دو چار سال میں شمائلہ کی شادی کی بھی فکر کرنی ہوگی۔ اتنے سارے مسائل سے آخر کیسے نمٹا جائے گا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ فیصل صاحب کی پیشکش سے انکار کرنے کے بعد میری جاب بھی باقی نہیں رہے گی۔ صدف کا پیش کردہ حل محض جذباتیت کا اظہار ہے۔ اس سے ''مسئلہ'' حل نہیں ہوگا بلکہ دیگر کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' مجھے احساس نہیں ہوا کہ بولتے بولتے میرا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن صدف نے جو تجویز دی تھی وہ کل تک کے حالات کے مطابق تھی۔ تمہارے پاس آج ایک زیادہ بہتر اور آسان حل موجود ہے اس لیے تم چاہو تو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔'' چچا کا سپاٹ لہجے میں دیا گیا جواب مجھے ہوش میں لے آیا میں فوراً بولا۔

''ناراض مت ہوں چچا جان۔ میں آپ کے مشورے اور اجازت کے بغیر قطعی کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ موجودہ حالات میں تمہارے لیے اپنے باس کی آفر قبول کر لینا ہی سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔ تم اللہ کا نام لے کر انہیں ہاں کر دو اور اس طرف سے بے فکر رہو کہ ہماری طرف سے کوئی شکایت یا ناراضی سامنے آئے گی۔ تمہارے اور صدف کے رشتے کی بات ابھی تک گھر میں ہی تھی اس لیے میرا خیال ہے کہ اس بات سے صدف کے مستقبل پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ میری بچی بہت سادہ اور نیک فطرت کی مالک ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی اور بہت اچھا انتظام کر دیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' چچا کے بے حد رسان سے کہے گئے جملوں کے اختتام پر میں نے زیرِلب کہا اور یوں ہلکا پھلکا ہو گیا جیسے کوئی بھاری بوجھ میرے شانوں سے ہٹا دیا گیا ہو۔

☆☆☆

فیصل صاحب کو ہانیہ حسین کے لیے ہاں کرتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شادی کے لیے اتنی جلدی مچائیں گے۔ انہوں نے ہفتہ بھر بعد ہی شادی انجام دینے کا فیصلہ سنا ڈالا۔ بقول ان کے اب ان سے ہانیہ کی ویران زندگی مزید نہیں دیکھی جاتی اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بھتیجی جلد از جلد زندگی کے رنگوں اور خوشیوں میں شامل ہو جائے۔ میرے پاس بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ میری ہاں کے ساتھ ہی فیصل صاحب نے امی کے علاج کے سلسلے میں بھرپور تعاون شروع کر دیا تھا۔ اب وہ ایک انتہائی مشہور اونکولوجسٹ کے زیرِ علاج تھیں اور ان کو نمایاں افاقہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس لائق بھی ہو گئی تھیں کہ صرف ایک گھنٹے کے لیے سہی میری شادی کی تقریب میں شرکت کر سکیں۔ اس موقع پر میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے اداسی کے رنگ دیکھے تھے۔ حقیقتاً سب ہی بہت اداس تھے۔ صدف کے بجائے کسی اور کو میری دلہن کے روپ میں دیکھنا ان سب کے لیے ہی ایک امتحان تھا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ کوئی کھل کر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چچا جان کی پوری فیملی نے صدف سمیت شادی میں شرکت کی تھی۔ چچی کا رویہ ذرا کھچا ہوا تھا لیکن باقی سب ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ صدف نے بھی اپنے دل کا غم چہرے پر نہیں آنے دیا تھا اور ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے شادی کی تقریب میں شریک رہی تھی۔ چچا جان نے اس کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی بڑی صابر اور ایثار پسند لڑکی تھی۔ وہ نہ تو میرے سامنے روئی تھی اور نہ ہی راستہ بدلنے پر بے وفائی کے طعنے دیے تھے اور یوں ہوگئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن کچھ کیسے نہیں ہوا تھا۔ میرے دل کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ میں نے بہت مہنگا سودا کیا ہے۔ شہر کی مشہور ترین ڈیزائنر کے تیار کردہ قیمتی عروسی جوڑے میں ملبوس، ہیرے جڑے زیورات میں دمکتی ہانیہ حسین میرے پہلو میں بیٹھ کر بھی میرے دل کو اس طرح نہیں کھینچ رہی تھی جس طرح وہ اِدھر اُدھر مہمانوں کے درمیان گھومتی صدف کی طرف کھچا جا رہا تھا۔

شادی کی تقریب میں شہر کے بہت سے معززین نے شرکت کی تھی۔ مجھے بھی فیصل صاحب نے اجازت دی تھی کہ میں جسے چاہوں انوائٹ کرلوں لیکن میں نے بس چند بہت ہی قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا تھا۔ چچا جان نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی تھی کیونکہ ہانیہ کا تعلق جس کلاس سے تھا ہمارے رشتے داروں کو ان کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں مشکل پیش آتی اور خوامخواہ کوئی ناخوش گوار صورتِ حال کری ایٹ ہونے کا اندیشہ رہتا۔ رخصتی کا وقت آیا تو دلہن کے بجائے دولھا کی رخصتی عمل میں آئی۔ فیصل صاحب نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا کہ میری خواہش پر میرے گھر والوں کے لیے بہترین رہائش گاہ کا بندوبست کردیا جائے گا لیکن میں انہیں اپنے ساتھ ہانیہ کی کوٹھی میں نہیں رکھ سکوں گا کیونکہ یہ عمل ہانیہ کو گراں محسوس ہوسکتا ہے۔ میں اس بات پر خاصا جز بز ہوا تھا اور پریشان تھا کہ گھر والوں کے علم میں کیسے یہ بات لاؤں لیکن ان کی طرف سے سامنے آنے والے فیصلے نے خود ہی مجھے کشمکش سے نکال دیا۔ جبران نے بہت صاف الفاظ میں مجھ سے کہا کہ حالات کے پیشِ نظر اگرچہ ان لوگوں نے میری شادی کو قبول کرلیا ہے لیکن وہ اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر جانا بالکل پسند نہیں کریں گے۔ یہ اس کا، امی کا اور شمائلہ کا مشترکہ فیصلہ تھا جو مجھے بھاری دل سے قبول کرنا پڑا، ہاں اتنا اطمینان ضرور تھا کہ وہ لوگ چچا کے سایۂ شفقت میں رہیں گے اور چچا آیندہ بھی مجھ سے ہر ممکنہ تعاون کرتے رہیں گے۔

رخصتی کے بعد میں اور ہانیہ سجی سجائی بڑی سی قیمتی گاڑی میں جسے باوردی شوفر چلا رہا تھا ہانیہ کی کوٹھی پہنچ گئے۔ کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی کے پیچھے ہی فیصل صاحب کی گاڑی بھی پورچ میں آکر رکی۔ اس گاڑی میں ان کے ساتھ ان کی مسز اور اکلوتی بیٹی طوبیٰ موجود تھیں۔ ہانیہ کے مقابلے میں طوبیٰ ایک بے حد حسین لڑکی تھی جس کے ہونٹوں پر مستقل کھیلتی مسکراہٹ اس کے خوش مزاج ہونے کا بھی پتا دیتی تھی۔ اس کے انداز میں ہانیہ جیسا کروفر اور بے نیازی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ہانیہ جیسی بے اندازہ دولت کی مالک نہیں تھی اور اس کے باپ کے ایچ ایچ بلڈرز میں صرف دس فیصد شیئرز تھے۔ طوبیٰ نے ہانیہ کو گاڑی سے اتار کر اندر لے جانے کے لیے سہارا دیا جبکہ فیصل صاحب اور ان کی مسز وہیں رکے رہے۔ اس صورت میں مجھے بھی وہیں رکنا پڑا۔

''میری لاڈلی بھتیجی تمہارے حوالے ہے کامران۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کا ہر طرح سے خیال رکھو گے اور اس کی ہر غلطی کو خندہ پیشانی سے نظر انداز کردو گے۔ آج سے یہ گھر تمہارا اور ہانیہ کا ہے اور تم دونوں ہی نے مل کر اس کی عزت اور وقار کا خیال رکھنا ہے۔ ہم سب یہاں تم دونوں کی اجازت سے مہمانوں کی طرح آئیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی اس سب کے بدلے میں، میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہانیہ کو کبھی تمہاری ذات سے کوئی تکلیف نہ ہو۔'' فیصل صاحب نے ایک بار پھر مجھ سے وہ سب کچھ کہا جو پچھلے پورے ہفتے میں متعدد بار کہہ چکے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک بیٹی کے باپ کا حقیقی تاثر تھا البتہ ان کی مسز کے انداز میں قدرے بے نیازی اور بے زاری تھی۔

''آپ بے فکر رہیں سر! میں ہانیہ کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں انہیں یقین دہانی کروا رہا تھا کہ طوبیٰ واپس آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر مستقل موجود رہنے والی مسکراہٹ ایسے لمحے کچھ پھیکی محسوس ہو رہی تھی۔ ''آپ پاپا کو سر کیوں کہہ رہے ہیں۔ اب آپ کو انہیں انکل کہنا چاہیے کیونکہ اب آپ ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔'' اس نے مجھے ٹوکا تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دوبارہ واپس آچکی تھی۔

''طوبیٰ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے کامران۔ اب تمہیں مجھے ہانیہ کی طرح انکل ہی کہنا چاہیے۔'' فیصل صاحب نے بھی بیٹی کی تائید کی۔

''جی جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے فوراً فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا جواب میں وہ میرے شانے کو تھپک کر واپس گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان کی مسز اور طوبیٰ نے بھی ان کی پیروی کی۔ گاڑی حرکت میں آئی تو طوبیٰ نے ہاتھ ہلا کر مجھے بائے کہا۔ جواب میں میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد میں اندر آیا تو دل میں یہ خیال تھا کہ صدف کی محبت کو بھول کر ہانیہ کو وہ سب کچھ دوں گا جو اس کا حق ہے۔ اندر ایک ملازمہ نے میری ہانیہ کے بیڈروم تک راہ نمائی کی۔ قیمتی فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز سے سجا بیڈروم اس وقت بے حد خوبصورت حجلۂ عروسی کا منظر پیش کر رہا تھا لیکن اس منظر میں دلہن غیر موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو چنانچہ خود ایک دبیز صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس بارہ منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ہانیہ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی دلہن کی ساری سج دھج غائب تھی اور وہ نہائی دھوئی کاٹن کی آرام دہ نائٹی میں اس طور میرے سامنے موجود تھی کہ میری طرف اس کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ باتھ روم سے نکلنے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر موجود ڈھیروں ٹیوبس اور بوتلوں میں سے ایک ٹیوب منتخب کی اور اس میں سے کریم نکال کر اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مساج کرنے لگی۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف نگاہِ غلط ڈالے بغیر ایک ملحقہ دروازہ کھول کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں ششدر سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ ایسا سلوک تو شاید کبھی کسی دلہن نے اپنے دولہا کے ساتھ نہ کیا ہو۔ میں کچھ دیر متذبذب سا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ فیصل صاحب نے مجھ سے اپنی لاڈلی بھتیجی کو خوش رکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن بھتیجی صاحبہ نے تو مجھے قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے اس انداز پر مجھے توہین کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اس سے قبل کہ یہ احساس مجھے مشتعل کرنے لگتا مجھے اپنی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ فیصل صاحب کی باتیں بھی یاد آنے لگیں۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اپنے والد کی ڈیتھ کے بعد سے ہانیہ مسلسل ڈسٹرب ہے۔ وہ اپنے والد سے اتنی شدید محبت کرتی تھی تو یقیناً اپنی زندگی کے اس موقع پر اس نے انہیں بہت مس کیا ہوگا اور مزید ڈسٹرب ہو گئی ہوگی۔ اب یہ میرا کام تھا کہ اسے اس ڈپریشن سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ ہانیہ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات محسوس کرتا ہوا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے پیچھے وہ غائب ہوئی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچنے پر مجھے اندر سے اس کی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں اور جذبۂ ہمدردی مزید گہرا ہو گیا۔

میں نے ناب گھما کر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن دیواروں میں جڑے بک شیلف فوراً ہی نظر آ گئے۔ مجھے یاد آیا کہ ہانیہ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے فیصل صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ہانیہ کتابوں کی بہت رسیا ہے اور گھر میں موجود اپنے والد کی بڑی سی اسٹڈی کے علاوہ بھی اس نے اپنے بیڈروم کے ساتھ ایک اسٹڈی روم بنوا رکھا ہے۔ جہاں وہ اتنا زیادہ وقت گزارتی تھی کہ اس کے والد نے اس کے آرام کے خیال سے وہاں ایک صوفہ کم بیڈ ڈلوا دیا تھا۔

میں نے دروازے کو کچھ اور دھکیلا تو مجھے وہ صوفہ کم بیڈ اور اس پر موجود ہانیہ دونوں نظر آ گئے۔ ہانیہ کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی جسے دیکھتے ہوئے وہ اتنی شدت سے رو رہی تھی کہ اسے میری موجودگی کا بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تصویر اس کے والد کی ہے یعنی میرا یہ اندازہ درست تھا کہ اپنی زندگی کے اس اہم موقع پر وہ اپنے عزیز والد کو یاد کر رہی ہے اور ڈپریشن کا شکار ہے۔ دل میں ہمدردی کا موجزن سمندر لیے میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اس کا نام پکارتے ہوئے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اسے اپنے بازو میں سمیٹ لوں گا اور اس کے ساتھ اس کا غم بانٹوں گا لیکن وہ تو میری آواز سن کر یوں اچھل کر کھڑی ہوئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہاتھ میں پکڑی تصویر کو اب اس نے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میرا اسے خود میں سمیٹنے کے لیے اٹھا بازو ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔ ''تم...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی بلا اجازت یہاں آنے کی۔'' فوری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ بے حد طیش کے عالم میں چلّائی۔

''میں تمہارا شوہر ہوں ہانیہ اور مجھے حق ہے کہ میں کسی بھی قسم کی اجازت کے بغیر تمہارے پاس آ سکوں۔'' اس کا انداز برا لگنے کے باوجود میں نے نرم لہجے میں اسے احساس دلایا۔

''کسی غلط فہمی میں مت رہنا مسٹر۔ یہ میرا گھر ہے اور اس پر صرف میرا حق ہے۔ یہاں رہنے والے ہر فرد کو میری مرضی کے مطابق رہنا ہوگا جسے قبول نہ ہو وہ یہاں سے جا سکتا

ہے۔'' شعلہ فشاں لہجے میں بولتی وہ کہیں سے بھی ایک کم عمر اور معصوم لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھ سے اتنی توہین برداشت نہ ہوسکی اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ توہین کا احساس اتنا شدید تھا کہ میں بیڈروم میں بھی نہیں ٹھہر سکا اور باہر نکل کر لان میں پہنچ گیا۔ میرے بس میں ہوتا تو ہانیہ حسین اور اس کی کوٹھی پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جاتا لیکن میرے پیروں میں مجبوری کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں بہت دیر تک لان میں ٹہلتا رہا اور آخر کار خود کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگیا کہ اگر مجھے امی کا بہترین علاج کروانے کے ساتھ ساتھ اپنا اور اپنے بہن بھائی کا مستقبل سنوارنا ہے تو اس بدمزاج و بددماغ لڑکی کو برداشت کرنا ہوگا۔ میں ذرا برداشت اور ہوشیاری سے کام لیتا تو چند سال میں اتنا سمیٹ سکتا تھا کہ ہانیہ کو چھوڑ کر بھی اچھی زندگی گزار سکوں۔ ہانیہ کی دولت کے سہارے میرا مستقبل سنور جاتا تو اس کی بدمزاجی سہنے کی چند سالہ مشقت کا ازالہ بھی ہوسکتا تھا۔ کیا عجب تھا کہ اس وقت صدف بھی میرے سنگ ہوتی۔ یہ کوئی ایسی ناممکن بات تو نہیں تھی۔ میں صدف سے اس سلسلے میں بات کرسکتا تھا۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی کہ چند سال انتظار کرسکتی تھی۔ میں اپنی پسند کے حساب سے فیصلہ کرچکا تو کھولتا ہوا دماغ بھی معمول پر آگیا اور میں بڑے اطمینان سے جاکر سجے سجائے حجلہ عروسی میں بنا دلہن کے لمبی تان کر سوگیا۔

☆☆☆

انسان کا مقدر کبھی اس کے سوچے سمجھے فیصلوں کے تابع نہیں ہوتا۔ اس بات کا علم مجھے اگلے روز ہی ہوگیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد فیصل صاحب کی فیملی دوبارہ کوٹھی۔۔ پہنچ چکی تھی۔ میں کیونکہ صبح کے قریب ہی سویا تھا اس لیے دوپہر تک سوتا ہی رہا۔ نہا دھو کر نیچے پہنچا تو فیصل صاحب اور ان کی فیملی سے ملاقات ہوگئی۔ ہانیہ بھی کاٹن کے اسٹائلش سے سوٹ میں ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ میرے نیچے پہنچتے ہی ملازمین ڈائننگ ٹیبل سجانے لگے۔ ہمارے ساتھ بالکل ویسا ہی سلوک کیا جارہا تھا جیسا کسی نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہانیہ یہ سب قبول کررہی ہے اور اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ ہوسکے کہ کل رات وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ کیسا توہین آمیز سلوک کرچکی ہے۔ میں نے بھی مصلحتاً چہرے پر خوشی اور اطمینان کا نقاب چڑھالیا۔ شام تک فیصل صاحب اور دیگر اہل خانہ ہمارے ساتھ ہی رہے پھر فیصل صاحب نے خود ہی حکم دیا کہ مجھے اور ہانیہ کو اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے جانا چاہیے۔ ہانیہ نے یہ حکم بھی خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ فیصل صاحب کی فیملی اور ہم لوگ آگے پیچھے ہی کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ گاڑی چلتے ہی ہانیہ کے چہرے پر موجود خوش اخلاقی کی جگہ سنجیدگی اور بیزاری نے لے لی۔

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں اس لیے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ تمہارے گھر پر نہیں ٹھہر سکوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں مجھے بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم ڈرائیور کے ساتھ واپس آجانا، میں وہیں رک جاؤں گا۔'' اس کا انداز برا لگنے کے باوجود میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ باقی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ گھر پہنچنے پر دروازہ جبران نے کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شمائلہ، عاشفہ اور سنبل کچن میں تھیں۔ البتہ صدف نظر نہیں آئی۔ ان تینوں نے کچن کی کھڑکی سے مجھے دیکھا تو خوش ہوگئیں اور ایک ساتھ بلند آواز میں سلام کیا۔ شمائلہ اور سنبل جوش میں باہر نکل آئیں۔ ان کی آوازیں یقیناً اندر ڈرائنگ روم میں بھی پہنچی تھیں جب ہی وہاں سے چچا جان برآمد ہوئے۔ مجھے اور ہانیہ کو دیکھ کر انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور ہمیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہاں تین چار خواتین اور دو حضرات موجود تھے جس میں سے ایک ادھیڑ عمر جبکہ دوسرا جوان اور اسمارٹ تھا۔ میں نے بلند آواز سے سلام کرنے کے بعد دونوں مردوں سے مصافحہ کیا۔ چچا جان میرا اور ہانیہ کا مہمانوں سے تعارف کروانے لگے۔ ان کی گرم جوشی کے جواب میں ہانیہ کا انداز سرد اور اکھڑا ہوا تھا جس کی تلافی کے لیے مجھے زیادہ ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا لیکن تعارف کے اگلے مرحلے میں میرے لیے بھی یہ امر مشکل ہوگیا۔ چچا جان بتا رہے تھے۔

''کامران میاں یہ وہی لوگ ہیں جو کافی عرصے سے صدف کے رشتے کے خواہاں ہیں۔ ہماری طرف سے انکار کے باوجود بھی ان کی طرف سے اصرار جاری تھا۔ آج صبح بھی بہن جی نے اس سلسلے میں فون کیا تو میں نے بھابی بیگم کے مشورے سے انہیں مدعو کرلیا۔ اب یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بغیر کسی تکلف کے اسی وقت سادگی سے رسم ادا کردی جائے بعد میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد شادی کی کوئی تاریخ مقرر کرلی جائے گی۔''

میں جو سوچ رہا تھا کہ ہانیہ حسین کے ساتھ مشکل کے چند سال گزارنے کے بعد دوبارہ صدف کے پاس لوٹ آؤں گا پہلے ہی مرحلے پر اس مایوس کن خبر کو سن کر ساکت رہ گیا۔

''یہ بالکل مناسب فیصلہ ہے منیر۔ میرے خیال میں کسی تاخیر کے بغیر صدف بیٹی کو یہاں بلواؤ اور یہ فریضہ انجام دے ڈالو۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے۔'' میری خاموشی کو فوراً ہی امی کی آواز نے توڑا۔ اس کے بعد وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ چچی کی ہدایت پر تینوں لڑکیاں صدف کو اپنے گھیرے میں لیے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں۔ صدف نے گلابی رنگ کا ہاتھ کی کڑھائی والا کاٹن کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ سنگار کے نام پر اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کے سوا کچھ نہیں تھا پھر بھی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ ہانیہ کی کل کی بے تحاشا تیاری اس کے سامنے ہیچ تھی۔ سوگواری صدف کو اس نوجوان کے برابر والے صوفے پر بٹھا دیا گیا جسے مجھ سے عاکف وقاص کے نام سے متعارف کروایا گیا تھا۔ مہمان خواتین جن میں سے ایک عاکف کی والدہ، دوسری چچی اور باقی دو بہنیں تھیں فوراً حرکت میں آ گئیں۔ مٹھائی اور پھل کے ٹوکروں کے ساتھ لائے گئے پھولوں کے ہار پہلے ہی میری نظر میں آ چکے تھے، بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ لوگ مکمل تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ عاکف کی والدہ نے صدف کی مخروطی انگلی میں سونے کی جڑاؤ انگوٹھی پہنائی۔ چچی نے لفافہ تھمایا اور دونوں بہنوں نے گفٹ پیک تھمائے۔ اتنا اہتمام دیکھ کر چچا یقیناً بوکھلائے تھے اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ جواب میں عاکف کو کچھ نقد رقم دے سکیں لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ منہ میٹھا کرنے کے علاوہ کچھ بھی لینا پسند نہیں کرے گا۔ چچا کے اصرار کو بھی اس نے بہت محبت اور سلیقے سے رد کر دیا۔ پورے گھرانے کے انداز و اطوار سے ظاہر تھا کہ وہ نہایت شائستہ اور مہذب لوگ ہیں۔ اصولاً مجھے خوش ہونا چاہیے تھا کہ صدف کو اتنا اچھا گھرانا ملنے والا ہے لیکن میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا اور اس کے کسی اور کا ہو جانے کا خیال مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ میں بس مارے باندھے ہی اس محفل میں شریک تھا۔ ہانیہ بھی بڑی بیزاری سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھے چلنے کا اشارہ دے دیا۔ میں جو دیر تک گھر والوں کے ساتھ رکنے کا ارادہ لے کر آیا تھا خود بھی مزید نہ بیٹھ سکا اور ہانیہ کی تھکن کا بہانہ کر کے خود بھی اس کے ساتھ ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

واپسی کے سفر میں بھی ہمارے درمیان خاموشی رہی لیکن مجھے اس خاموشی سے کیا فرق پڑتا۔ میرے تو اپنے اندر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

☆☆☆

شب و روز بڑی بے کیفی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ صدف کی رخصتی صرف پندرہ دن بعد ہونا طے پا چکی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ چچا کے لیے اتنی جلدی انتظامات کرنا مشکل ہوگا اس لیے میں نے انہیں اخراجات کے سلسلے میں ایک معقول رقم پیش کی جسے انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ عاکف وقاص کی جانب سے جہیز میں ایک تنکا بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے اصرار ہے کہ نہایت سادگی سے مسجد میں نکاح کی رسم ادا کی جائے اور ہر طرح کے فضول اخراجات سے گریز کیا جائے۔

چچا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ عاکف، صدف کو اس علیٰحدہ فلیٹ میں رکھے گا جو شادی کے موقعے پر اس کے والد کی طرف سے اسے تحفے میں دیا جا رہا ہے۔ عاکف کے والد کا خیال تھا کہ ایک گھر میں رہنے سے تمام تر کوشش کے باوجود خواتین کے درمیان ساس بہو اور نند والی روایتی چپقلش پیدا ہو جاتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ بہو اور بیٹے کو الگ رہ کر اپنی زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے تاکہ روایتی جھگڑے پیدا ہی نہ ہو سکیں۔ مجھے ان لوگوں کی اتنی کشادہ دلی پر حیرت ہوئی اور خود پر تھوڑا سا دکھ بھی کہ میں چچا کے کسی کام نہیں آ سکا۔ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی حالت کو سہارا دینے کے لیے میں نے دو تین بار ہانیہ کی طرف پیش قدمی کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ہر بار مجھے دھتکار دیا اور صاف لفظوں میں بتا دیا کہ اس نے صرف اپنے انکل فیصل........کے کہنے پر یہ شادی کی ہے ورنہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی طرف سے اس رویے کے بعد میرے پاس صرف دو ہی مصروفیات رہ گئی تھیں۔ امی کے علاج کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنا اور آفس کے معاملات دیکھنا۔ آفس میں اب میرا مقام تبدیل ہو گیا تھا۔ کل تک میں جن لوگوں کا کولیگ تھا آج وہ مجھے باس کی حیثیت سے عزت دینے لگے تھے۔ مجھ جیسی معمولی حیثیت کے شخص نے ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد اس عزت پر ہی قناعت کر لی تھی۔ مجھے کون سی ہانیہ سے محبت تھی کہ میں اس کے قرب کے لیے ترستا۔ ہاں دن رات میں اس فکر میں ضرور رہتا تھا کہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ مال

سمیٹ سکوں اور اس رشتے سے نجات پاؤں۔

فیصل صاحب ہنوز مجھ پر مہربان تھے۔ میں نے انہیں ہانیہ کے رویّے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ میری اور ہانیہ کی شادی سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ مجھے ایک داماد کے طور پر بھرپور عزت دیتے تھے۔ مجھے ہلکا سا شبہ تھا کہ ہانیہ شاید کسی اور کو پسند کرتی ہے اس لیے مجھ سے اتنی غافل ہے لیکن ایسے آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے جب بھی اسے چیک کیا تھا وہ گھر پر ہی موجود ہوتی تھی۔ وہ فون وغیرہ کے استعمال میں بھی زیادہ مصروف نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ شبہ ہو کہ وہ کسی سے رابطے میں ہے پھر پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ مجھے قطعی لفٹ کروانے کو تیار نہیں تھی۔ اس روز میں آفس سے واپس آیا تو اسے کسی سے فون پر بات کرتے سنا۔ وہ کسی سے دبئی کے دو ائر ٹکٹس کی بات کر رہی تھی۔ پل بھر کے لیے مجھے یہ خوش فہمی ہوئی کہ دوسرا ٹکٹ میرے لیے ہے لیکن میرے سامنے ہی اس نے اگلی کال طوبیٰ کو کی اور اسے اطلاع دی کہ وہ اس کے ساتھ دبئی جا رہی ہے۔

''تم دبئی جا رہی ہو جبکہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صدف کی شادی ہے۔ تم شادی میں شرکت کے بعد بھی جا سکتی ہو۔'' وہ فون سے فارغ ہوئی تو میں نے اعتراض کیا۔

''تمہاری کزن کی شادی تمہارا مسئلہ ہے۔ تم شوق سے شرکت کرو اور گفٹ کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہو لے لو لیکن مجھ سے فضول مطالبات کرنے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں جواب دیا اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ایسے انداز مجھے تلملانے پر مجبور کرتے تھے لیکن اس کی دولت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ میری مرضی کے خلاف وہ طوبیٰ کے ساتھ دبئی روانہ ہو گئی۔ مجھے گھر والوں کے سامنے عذر تراشنا پڑا کہ وہ ایک بزنس ڈیل کے لیے گئی ہے میں امی کے علاج اور صدف کی شادی میں شرکت کی وجہ سے نہ جا سکا اس لیے اسے جانا پڑا۔ کسی نہ کسی طور بات نبھ گئی۔ گھر والوں نے بھی شاید میرا بھرم رکھنے کے لیے یہ عذر قبول کر لیا ورنہ ہانیہ کا رویّہ تو سب کے سامنے ہی تھا۔ پہلی بار کے بعد اس نے دوبارہ میرے گھر والوں سے ملنے کی زحمت نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی انہیں اپنی کوٹھی پر مدعو کیا تھا۔

صدف پرائی ہو گئی۔ امی کا علاج جاری رہا۔ علاج کے لیے ملنے والی رقم کے علاوہ بھی میں نے چند لاکھ ہوشیاری سے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لیے۔ امید یہی تھی کہ چند سال میں بہت سامال بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ فیصل صاحب مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور میں اس اعتماد کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اب میں نے امراء کے طور طریقے بھی اپنانے شروع کر دیے تھے۔ ہانیہ کی عدم موجودگی میں، میں بالکل آزاد تھا اس لیے آفس کے بعد میرا وقت رات گئے تک یا تو کلب میں گزرتا یا میں کسی رنگین تتلی کے سنگ شہر میں آوارہ گردی کرتا پھرتا۔ اس رات بھی میں کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب گھر واپس آیا تھا۔ امراء کے فیشن کے مطابق میں نے شراب بھی پی رکھی تھی لیکن اتنی مقدار میں نہیں کہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔ ملازمہ خاص نے گھر پہنچنے پر حسبِ معمول مجھ سے کھانے کے لیے دریافت کیا لیکن میں نے انکار کر دیا اور صرف کافی کی فرمائش کی۔

''او کے سر، میں ابھی دس منٹ میں بنا کر لاتی ہوں۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا پھر واپس پلٹنے سے پہلے بولی۔ ''آج شام ہانیہ بی بی کی کسی سہیلی کا ڈرائیور ان کی ڈائری دینے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا بی بی اپنی سہیلی کے گھر بھول کر آ گئی تھیں۔ اسٹڈی تو لاک ہے۔ میں نے ڈائری آپ کے بیڈ روم میں رکھ دی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ملازمہ کو مختصر جواب دیا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسٹڈی کو لاک کر کے ہانیہ نے میری سبکی کا ایک اور انتظام کیا تھا جس پر جلتا کڑھتا میں بیڈ روم میں آ گیا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھی ڈائری فوراً ہی میری نظر میں آ گئی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ ڈائری پڑھ کر ہانیہ کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ڈائری لے کر بیٹھ گیا۔ ابتدائی چند صفحات کے بعد ہی مجھ پر اس کے راز کھلنا شروع ہو گئے۔

''کافی سر۔'' میری محویت کو ملازمہ کی آواز نے توڑا۔ میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے بہت دل لگا کر بالکل آپ کی پسند کے مطابق کافی بنائی ہے۔ پینا مت بھولیے گا۔'' اس نے کافی کا مگ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کی ایک خوش اطوار عورت تھی جسے کوٹھی کے دیگر ملازمین کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے جب وہ بات کرتی تھی تو اس کے لہجے میں ایک خاص اعتماد ہوتا تھا۔

''ڈونٹ وری، تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی کافی میں

خود بھی مس کرنا پسند نہیں کروں گا۔'' ڈائری کے مندرجات نے اگرچہ میرے ذہن کو منتشر سا کردیا تھا پھر بھی میں نے اسے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ وہ واپس چلی گئی تو میں ایک بار پھر ڈائری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ڈائری پڑھتے ہوئے میں کافی کی چسکیاں بھی لیتا رہا۔ ڈائری کیا تھی بس انکشافات ہی انکشافات تھے۔ ابتدائی صفحات میں ہانیہ نے اپنے ڈیڈی کے انتقال کے بعد خود پر گزرنے والی کیفیات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ واقعی وہ اپنے باپ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ دردو الم سے بھرے ان ایام کے تذکرے کے دوران بتدریج کامران نامی ایک لڑکے کا ذکر آنے لگا۔ کامران اس کے ڈیڈی کے کسی دوست رستم کا بیٹا تھا جس نے ہانیہ کو غم اور صدمے کی کیفیت سے نکال کر دوبارہ زندگی میں شامل ہونے کا حوصلہ دیا۔ کامران کی اس توجہ اور خلوص نے ہانیہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ اس محبت میں اتنی شدت اور تندی تھی کہ وہ دونوں تمام حدود پار کرتے چلے گئے اور نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ اس سے قبل کہ ہانیہ اس سلسلے میں کامران سے کوئی بات کرپاتی اس کی زندگی میں دوسرا بڑا حادثہ پیش آگیا۔ کامران ایک شدید روڈ ایکسیڈنٹ میں زندگی کی بازی ہار گیا۔ ظاہر ہے صدمے نے ہانیہ کو دیوانہ کردیا لیکن اپنی طبیعت کی خرابی نے اسے زیادہ دن دیوانگی بھی نہیں دکھانے دی۔ اپنی کزن اور ہم راز سہیلی طوبیٰ کے ذریعے اس نے یہ اطلاع اپنی چچی کو دی۔ چچی نے اس کو ابارشن کا مشورہ دیا لیکن ہانیہ اپنی محبت کی نشانی کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہوئی چنانچہ طے یہ پایا کہ خاندان کی عزت بچانے کے لیے کوئی کاٹھ کا الو تلاش کیا جائے۔ ظاہر ہے ایسا اُلو وہی آدمی بن سکتا تھا جسے اس کی ضرورتوں اور مسائل نے مجبور کررکھا ہو۔ چچا نے لاڈلی بھتیجی کا گناہ چھپانے کے لیے تلاش شروع کردی اور بڑی آسانی سے مجھے پالیا۔ اتفاق سے میرا نام بھی کامران تھا اس لیے ہانیہ حسین نے میرے انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ اس طرح اس کے ہونے والے بچے کو وہی نام ملتا جو اس کے اصل باپ کا تھا۔ دولت سے خریدے گئے نمائشی شوہر کے ساتھ وہ وہی سلوک کرتی تھی جو اس کے خیال میں درست تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنے مرحوم محبوب سے وفا نبھا رہی تھی۔ ان ساری تفصیلات کو پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ اسٹڈی میں بیٹھ کر جس تصویر کو سینے سے لگا کر روتی ہے وہ اس کے باپ کی نہیں بلکہ محبوب کی ہوگی۔ ساری صورت حال سمجھ کر میرا فشارِ خون بلند ہونے لگا۔ چچا، بھتیجی نے کس چالاکی سے گیم کھیلا تھا اور کتنی آسانی سے مرے ہوئے عاشق کی نشانی کو زرخرید شوہر کا نام دینے کا انتظام کرلیا تھا۔ شادی کے بعد اتنی جلدی بچہ دنیا میں آتا تو دنیا والوں سے کہہ دیا جاتا کہ قبل از وقت پیدائش ہوئی ہے۔ میری کیا اوقات تھی کہ تردید کرسکتا اور لوگوں کو بتاتا کہ جس بچے کو میرا نام دیا جارہا ہے اس کی ماں کو تو مجھے ہاتھ لگانے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ وہ پیسے والے لوگ تھے۔ ہر طرح کا کھیل تماشا کرسکتے تھے لیکن مجھے حقیقتاً خود کو اُلو بنائے جانے پر غصہ آرہا تھا۔ اگر انہیں ایسی کوئی ڈیل کرنی ہی تھی تو فیئر طریقے سے کرتے۔ ہوسکتا تھا کہ اپنی مجبوریوں کے بدلے میں حقائق جاننے کے باوجود بھی بکنے کو راضی ہوجاتا لیکن اس صورت میں، میں اپنی صحیح قیمت تو لگا سکتا تھا۔ یہاں تو انہوں نے سارا سودا اپنی مرضی کا کیا تھا۔ غصے اور اضطراب کی کیفیت میں، میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آیا تو فیصل صاحب کا نمبر ملا ڈالا۔

''کیا بات ہے کامران، اتنی رات کو کیسے فون کیا ہے؟'' انہوں نے کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی اور غنودہ سی آواز میں پوچھا۔

''رات ہوگی تمہارے لیے۔ میری آنکھیں تو ابھی کھلی ہیں۔'' میں نے بگڑتے ہوئے لہجے میں بدتمیزی سے جواب دیا۔ مجھے احساس تھا کہ میری آواز لہرا رہی ہے۔ شاید شراب اور غصے نے مل کر اعصاب پر اثر انداز ہونا شروع کردیا تھا۔

''کیا مطلب؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''میری طبیعت ٹھیک ہے لیکن میں تم چچا بھتیجی کا دماغ ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے دھوکا دیا! میں اپنے ساتھ کیے گئے اتنے بڑے دھوکے کو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔'' میں اتنی زور سے دہاڑا کہ میرے گلے میں خراش سی پڑ گئی۔ پھر مجھے مزید گفتگو جاری رکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور میں بستر پر گر گیا۔ اعصاب پر بہت دیر سے حملہ کرتی دھند اب پوری طرح غالب آنے لگی تھی۔ اس دھند نے کچھ اس طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لیا کہ میں ذرا ہی دیر میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔ دوبارہ میری آنکھ چہرے پر ڈالے جانے والے یخ پانی کی وجہ سے کھلی۔ کچھ پل کے لیے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں ٹکر ٹکر ان پولیس والوں کو دیکھنے لگا جو میرے اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ ان پولیس

والوں کے درمیان مجھے فیصل... کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر گہرے غم کے آثار تھے۔

''ہتھکڑی لگاؤ اسے۔'' مجھے ہوش میں دیکھ کر پولیس انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

''لیکن کس جرم میں؟'' میں ہتھکڑی لگوانے میں مزاحمت کرنے لگا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ رات میں نے سونے سے قبل فون پر فیصل سے کچھ بدتمیزی کی تھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ مجھے ہتھکڑی لگوادیتے۔

''یہ سب کیا ہے انکل؟ آپ مجھے اریسٹ کیوں کروا رہے ہیں۔ گھر کی بات تو گھر میں بھی طے پاسکتی تھی۔'' مجھے معلوم تھا کہ میں کس حیثیت کا آدمی ہوں اور میرے چچا سسر کی کیا حیثیت ہے اس لیے فوراً ہی مفاہمت پر اتر آیا۔

''بکواس بند کر کمینے۔ میں تجھے اپنی بھتیجی کا قتل کسی صورت میں معاف نہیں کرسکتا۔'' مجھے نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ زور سے دہاڑے تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ہانیہ تو دبئی میں تھی اور یہاں مجھ پر اس کے قتل کا الزام لگایا جارہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں لب کشائی کی کوشش کی اور بہت چیخا پکارا لیکن پولیس والے مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

☆☆☆

حوالات کے فرش پر پڑا میں بری طرح کراہ رہا تھا۔ تھانے لانے کے بعد میری ٹھیک ٹھاک پٹائی کی گئی تھی۔ یہیں مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ ہانیہ آج صبح سویرے دبئی سے واپس آگئی تھی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے شدید اشتعال اور نشے کی حالت میں اسے چھرے سے وار کر کے قتل کیا ہے۔ کیونکہ میرے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ میری نو بیاہتا بیوی تین مہینے کی حاملہ ہے اور کسی اور کا گناہ میرے سر تھوپنے کی کوشش کررہی ہے۔ میں پولیس والوں سے لاکھ کہتا رہا کہ میرا ہانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ آج واپس آنے والی ہے لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے گھر والوں کو ان حالات کا علم ہے یا نہیں کیونکہ یہاں مجھ سے کوئی ملنے نہیں آیا تھا۔ دن بھر میں اپنی چوٹوں کو سہلاتا حوالات کے فرش پر بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ رات دس بجے کے بعد جب تھانے میں ذرا چہل پہل کم ہوئی تو پہرے پر موجود ایک سپاہی نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میں حیران سا سلاخوں کے پاس پہنچ گیا۔

''تمہیں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے شہزادے، تمہارے گھر سے ایک بزرگوار تم سے ملنے آئے تھے لیکن ایس ایچ او صاحب نے اجازت نہیں دی۔ انہیں مقتولہ کے چچا کی طرف سے سخت ہدایت ہے کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کی جائے۔ تمہارے خلاف بڑی سخت ایف آئی آر کاٹی گئی ہے اور کل عدالت میں پیش کرنے کے لیے بڑے پکے ثبوت اور گواہ تیار کیے گئے ہیں۔ سمجھو کہ تم پر بڑی مصیبت آنے والی ہے۔'' سپاہی دھیمی آواز میں مجھے منحوس خبریں سنانے لگا لیکن اس کا انداز ہمدردی اور اپنائیت لیے ہوئے تھا اس لیے میں بھی اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی سنتری بادشاہ کہ یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میری بیوی گھر آچکی ہے اور ان لوگوں نے مجھ پر اتنا بڑا الزام لگادیا۔ میں غریب آدمی ہوں اور میرے سسرال والے اونچی حیثیت کے لوگ۔ میں تو ان کے مقابلے میں اپنا بچاؤ بھی نہیں کرسکتا۔'' میں سپاہی کی ہمدردی پاکر تقریباً رو پڑا۔

''بچاؤ کی ایک صورت نکل رہی ہے تمہارے لیے۔ چاہو تو اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہو۔'' سپاہی نے سرگوشی کی تو میں ہکّا بکّا اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بھولے کبوتر...... کل عدالت میں حاضری کے وقت ذرا ہوشیار رہنا۔ وہاں بہت کچھ ہونے کا امکان ہے۔'' سپاہی نے ایک آنکھ دبا کر مجھ سے کہا تو پوری بات سمجھ نہ آنے کے باوجود میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں نے وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تفصیل کل ہی پتا لگے گی تمہیں۔ ابھی تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کے بندوبست کرتا ہوں۔''

وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ کھانے میں وہ میرے لیے تندوری روٹی اور نہاری لایا تھا۔ میں سارا دن کا بھوکا تھا۔ چنانچہ سستے سے ہوٹل سے لایا گیا یہ کھانا بھی خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد دودھ پتی نے مزہ دوبالا کردیا۔ سپاہی نے مجھے درد کی دو گولیاں بھی دیں اور آخر میں جلتا ہوا سگریٹ بھی پیش کیا۔ اس کے ہم منصب ساتھی یہ سب کچھ بے نیازی سے دیکھتے رہے اور کسی نے دخل اندازی نہیں کی کیونکہ تھانہ کلچر میں یہ ایک عام سی بات تھی کہ گرفتار شدہ شخص یا اس کے اقارب کی

طرف سے کھلا خرچہ پانی ملنے پر سپاہی ہر طرح کی سہولت فراہم کر دیتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ سہولتیں کس کے ایما پر فراہم کی جارہی ہیں۔ میں بس الجھا الجھا سا فائدہ اٹھاتا رہا۔ پیٹ میں غذا گئی اور درد کشا گولیوں نے اثر دکھانا شروع کیا تو مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ میں ننگے فرش پر ہی لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔ صبح اٹھا تو خود کو خاصا تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ ناشتے میں مجھے سیاہی مائل چائے کا کپ اور دو پاپے تھمائے گئے اور پھر عدالت جانے کا وقت آ گیا۔ باری آنے پر جب عدالت میں میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی تو واقعات کو کچھ اس طرح سامنے لایا گیا۔

''ایچ ایچ بلڈرز کے شیئر ہولڈر فیصل صاحب نے مجھے ایک شریف اور محنتی نوجوان جانتے ہوئے اپنی اکلوتی بھتیجی کا شوہر منتخب کیا تھا۔ انہیں امید تھی کہ میں ان کی بھتیجی کا بھرپور خیال رکھوں گا لیکن بعد میں حالات مختلف طریقے سے سامنے آئے اور انہیں اندازہ ہونے لگا کہ میں ایک لالچی انسان ہوں جو والدہ کی بیماری کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے اپنے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کر رہا ہوں۔ رقم کی منتقلی والی بات درست تھی جس سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مزید جو واقعات بیان کیے گئے ان کے مطابق میرا رویہ ہانیہ کے ساتھ سرد مہری کا تھا اس لیے وہ دل بہلانے کے لیے اپنی چچازاد طوبیٰ کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے دبئی چلی گئی۔

بیوی کی غیر موجودگی میں، میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ گھریلو ملازمہ کے بیان کے مطابق وقوعہ والی رات بھی میں نشے میں دھت گھر آیا اور ہانیہ کی اسٹڈی میں جا گھسا۔ ملازمہ حکم کے مطابق کافی پہنچانے بیڈروم میں پہنچی تو اس نے مجھے ہانیہ کی پرسنل ڈائری پڑھتے ہوئے پایا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ صبح کی فلائٹ سے ہانیہ کی واپسی پر ڈرائیور اسے ائرپورٹ سے لے کر آیا تو ملازمہ نے ہمارے بیڈروم سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنیں۔ پھر اسے ہانیہ کی ایک دو چیخیں بھی سنائی دیں لیکن وہ ہمت نہیں کر سکی کہ دخل اندازی کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصل صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے کوٹھی پر پہنچ کر پہلے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی اور کوئی ردعمل ظاہر نہ ہونے پر چابی کی مدد سے لاک کھولنے کا حکم دیا۔ لاک کھول کر وہ لوگ اندر پہنچے تو انہوں نے مجھے جوتوں سمیت بستر پر سویا ہوا پایا۔ بیڈروم بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ فیصل صاحب نے اسٹڈی میں جا کر دیکھا تو وہاں ہانیہ کی خون میں لت پت لاش ملی۔ انہوں نے فوراً علاقے کے تھانے میں فون کیا جس کے بعد میری گرفتاری عمل میں آئی۔ پولیس نے میرے خون وغیرہ کے جو نمونے لیے تھے ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ میں نا صرف شراب پیے ہوئے تھا بلکہ کوئی اور بھی زود اثر نشہ استعمال کیا تھا اس لیے قتل جیسی واردات کر کے فرار ہونے کے بجائے وہیں پڑ کر سو رہا۔ پولیس نے قتل کا محرک پیش کرنے کے لیے ہانیہ کی ڈائری اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ میں انگشت بدنداں یہ تڑے مڑے حقائق سنتا رہا اور پھر عدالت کے سامنے اپنا بیان دیا لیکن ظاہر ہے پولیس کی طرف سے جس انداز سے کیس تیار کیا گیا تھا عدالت نے آسانی سے اسے میرا ایک ہفتے کا جسمانی ریمانڈ دے دیا۔ جج کے اس فیصلے کے بعد مجھے عدالت سے باہر لے جایا جانے لگا تو رات مجھ سے ہمدردی سے پیش آنے والا سپاہی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''ملزم کو حاجت کے لیے بیت الخلا جانا ہے۔'' چار چھ قدم چلنے کے بعد ہی اس نے اپنے دیگر ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا۔ میں اس کی تردید کے لیے منہ کھولنا چاہتا تھا کہ اس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ میرا جسم یکدم اکڑ گیا اور مجھے اس کی رات والی ہدایت یاد آ گئی۔ اب میں سپاہیوں کے جلو میں بیت الخلا کی طرف جا رہا تھا۔

''ہوا دان کی سلاخیں نکلی ہوئی ہیں۔ وہاں سے دوسری طرف اتر جاؤ تو ایک بندہ تمہاری مدد کے لیے موجود ہوگا۔'' بیت الخلا کے دروازے تک صرف وہی سپاہی میرے ساتھ آیا تھا اور اس نے مجھ سے سرگوشی میں یہ بات کہی تھی۔ میں اندر جا کر کچھ دیر تذبذب میں کھڑا رہا کہ آیا اس کی بات مانوں یا نہیں۔ آخر کار میں نے فرار کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جس انداز میں کیس تیار کیا گیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے پھنسانے کے لیے بھرپور سازش کی گئی ہے اور میں پولیس کے قبضے میں رہا تو اپنی جان بچانے کے لیے ذرا ہاتھ پیر نہیں مار سکوں گا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک معما تھی کہ مجھے فرار ہونے کا موقع کس کے اشارے پر دیا جا رہا ہے۔ میں بیت الخلا کے ہوادان سے نکل کر باہر پہنچا تو سپاہی کے کہنے کے مطابق ایک بندہ میرے انتظار میں موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک چادر اوڑھنے کے لیے دی جسے اپنے گرد لپیٹ کر میں آسانی سے وہاں سے نکل گیا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں اس کے ساتھ نیلے رنگ کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو دریافت کیا۔

''تمہارے ایک ہمدرد کے پاس۔ باقی تعارف وہ

ملاقات ہونے پر خود کروائیں گے۔'' اس نے مجھے جواب دیا اور میرے مزید اصرار پر کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں خاموشی سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اسے گاڑی روکنے کے لیے کہتا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ فرار کے بعد سارے شہر کی پولیس میری تلاش پر مامور کر دی گئی ہوگی اور عافیت صرف اس گاڑی کے اندر ہے۔ آخر کار گاڑی متوسط طبقے کی آبادی کے ایک گھر کے سامنے جا رکی۔ میرے ساتھ موجود آدمی نے نیچے اتر کر گھنٹی بجائی تو فوراً دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک تیس بتیس سال کی عورت تھی جس نے شوخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر خاصا میک اپ تھا اور بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ ماتھے پر موجود بندیا اور مانگ میں بھری سندور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ عورت ہندو ہے۔ اس نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا اور گیٹ دوبارہ بند کر لینے کے بعد ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والا میرا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دستک کے جواب میں کسی نے دھیمی آواز میں اندر آنے کی اجازت دی۔ اجازت کے جواب میں مجھے اندر جانے کا اشارہ کر کے میرے ساتھ آنے والا خود باہر کھڑا رہا۔ میں جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجا کمرا تھا جہاں میرا سامنا ایک صوفے پر بیٹھے درمیانی جسامت کے تقریباً پچپن سالہ آدمی سے ہوا۔ اس کا لباس قیمتی تھا اور چہرے پر موجود وقار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی اونچی حیثیت کا مالک ہے۔

''تشریف رکھیے مسٹر کامران۔ میرا نام بیرسٹر رستم ملک ہے اور میرے ہی کہنے پر آپ کو مصیبت سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے۔'' مجھے بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تو میں چونک گیا۔

''بیرسٹر رستم ملک۔۔۔ کامران ملک کے والد اور ہانیہ حسین کے والد عنایت حسین کے دوست؟'' ہانیہ کی ڈائری سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں، میں نے اس سے تصدیق چاہی۔

''بالکل صحیح پہچانا۔ میں ہی ہوں کامران ملک کا بدنصیب باپ۔'' اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ اقرار کیا۔

''میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ نے میری مدد کیوں کی؟'' میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''انسانیت کے ناتے، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بیٹے کی طرح ایک اور بے گناہ نوجوان فیصل جیسے شیطان کی سازش کے جال میں پھنس کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔'' رستم ملک کے جواب پر میں بھونچکا رہ گیا۔

''یعنی آپ کے خیال میں یہ...... یہ سب فیصل صاحب نے کروایا ہے؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''اور کون ہے جسے یہ سب کرنے کی ضرورت ہوتی؟'' اس نے تلخی سے جواب دیا تو میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے؟''

''حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ فیصل کو ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت تھی جو تمہاری صورت اسے مل گیا۔'' ان کا لہجہ اب بھی تلخ لیکن مدھم تھا۔

''کیا آپ کچھ اور وضاحت کریں گے؟'' حالات نے میرا سر چکرا کر رکھ دیا تھا اس لیے میں نے وضاحت چاہی۔

''تم ذرا سا غور و خوض کرو تو خود بھی سمجھ سکتے ہو لیکن شاید اس وقت تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا ہے اس لیے میں ہی سمجھا دیتا ہوں۔'' انہوں نے نرمی سے جواب دیا اور سگار سے کش لینے کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''میرے دوست عنایت حسین کی کل جائداد کی مالک اس کی اکلوتی بیٹی ہانیہ حسین تھی لیکن اسے اس جائداد کا مختار اس وقت بنایا جاتا جب اس کی شادی ہو جاتی۔ ایچ ایچ بلڈرز میں دس فیصد شیئرز کا مالک عنایت کا بھائی فیصل کاروباری فیصلے کرنے کا اختیار تو رکھتا ہے لیکن کل انکم کی نگرانی میرے ذمے ہے۔ عنایت نے اپنی وصیت میں بالکل واضح کر دیا تھا کہ ہانیہ کو ہر ماہ اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم ضرور دی جائے گی لیکن وہ رقم مخصوص تھی۔ شادی سے پہلے اگر کسی بھی وجہ سے ہانیہ کی موت ہو جاتی تو ساری پراپرٹی ٹرسٹ کے حوالے کر دی جاتی۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ہانیہ کے بچے اس کے وارث ہوتے۔ شاید عنایت کو اپنے قریبی رشتوں سے کسی قسم کا کوئی خطرہ تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی میں ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ وصیت تیار کروائی تھی۔ عنایت کا انتقال ہوا تو میں نے اس وصیت پر عمل کروانا شروع کر دیا کیونکہ میں اس کا لیگل ایڈوائزر تھا۔ فیصل یہ جان کر کہ بھتیجی کی جائداد پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے اور وہ کسی بہانے اسے لوٹ نہیں سکتا بہت جز بز ہوا۔ اس کی کوئی اولاد نرینہ ہوتی تو شاید وہ ہانیہ کی اس سے شادی کی کوشش کرتا۔ بہر حال ایسا نہیں تھا اور اُدھر میرے بیٹے کامران اور ہانیہ کی بچپن کی دوستی محبت میں بدل گئی تھی۔ فیصل نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے ہانیہ کی دولت ہتھیانے کے

لیے اپنے بیٹے کو اس کے پیچھے لگایا ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ان دونوں کا اپنا فیصلہ ہے اور میرا اس میں کوئی دخل نہیں لیکن فیصل نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا پھر ایک روز میرا بیٹا کامران ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ وہ بہت زیادہ نشے کی حالت میں گاڑی چلا رہا تھا۔ بعد میں، میں نے تحقیقات کروائیں تو معلوم ہوا کہ حادثے سے پہلے کامران فیصل کے گھر پر تھا اور وہیں اس نے بہت زیادہ شراب نوشی کی تھی، کیوں اور کس لیے اس کا مجھے علم نہیں۔ نہ ہی میں اس بنیاد پر فیصل کے خلاف کوئی کیس کر سکتا تھا اس لیے چپ بیٹھا رہا۔ ہانیہ نے کامران کی موت کا بہت اثر لیا اور اکثر میرے پاس آتی رہتی تھی۔ ایک دن اچانک ہی اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے تو میں حیران رہ گیا لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ میرے کامران کی نشانی کو باعزت طور پر دنیا میں لانے کے لیے اس شادی پر مجبور ہے تو مجھے بھی اس کے فیصلے کی تائید کرنی پڑی۔ میں تمہاری شادی کی تقریب میں شریک تھا اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ تم ایک مجبور نوجوان ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے ساتھ دھوکے کا علم ہونے پر بھی تم کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکو گے اور معاملہ کسی ڈیل سے طے پا جائے گا لیکن ہانیہ کے تمہارے ہاتھوں قتل کا سن کر میں حیران رہ گیا اور جب کیس کی تفصیلات میرے علم میں آئیں تو میں سمجھ گیا کہ اس سب کے پیچھے فیصل کی سازش ہے۔ میں نے تمہیں اس سازش سے بچا کر نکالنے کا بندوبست کر دیا لیکن ظاہر ہے کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہو گی اور تم اس وقت تک آزادانہ زندگی نہیں گزار سکو گے جب تک فیصل اپنے انجام کو نہیں پہنچ جاتا اس لیے تمہارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ تم فیصل سے نمٹو۔ اس سے اس کا جرم اگلواؤ اور اپنے لیے نجات پا لو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مالی معاونت کرنے کے علاوہ مزید کچھ نہیں کر سکتا، آگے سب کچھ تمہیں اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔''

رستم ملک نے سازش کے سارے تانے میرے سامنے رکھ دیے۔ فیصل رضا کی ساری سازش سامنے آجانے کے بعد میں اپنے دل میں اس شخص کے لیے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک پل کی بھی تاخیر کیے بغیر اس کی گردن ناپنے کے لیے نکل کھڑا ہوں لیکن رستم ملک نے مجھے سمجھایا کہ میں جوش سے کام لینے کے بجائے تھوڑی عقل مندی کا مظاہرہ کروں۔ میں مفرور مجرم ہوں اس لیے بہتر ہے کہ دن کے اجالے میں باہر نکلنے کے بجائے رات کی تاریکی میں چھپ کر نکلوں۔ مجھے ان کی بات سمجھ آ گئی۔ دن دہاڑے میرے لیے فیصل کے بنگلے میں داخل ہونا ویسے بھی مشکل ثابت ہوتا۔ ''میرے خیال میں تمہیں یہ وقت آرام کرنے اور آگے کی پلاننگ میں صرف کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر میں، میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن یہاں موجود عورت تمہارا پورا خیال رکھے گی۔ تمہیں اپنے کام کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ سارا بندوبست ہو جائے گا۔'' مجھے... سوچ بچار میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد حلیے سے ہندو نظر آنے والی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

''میں نے آپ کے لیے باتھ روم میں کپڑے لٹکا دیے ہیں۔ آپ باتھ لے لیں پھر میں کھانا لگا دیتی ہوں۔'' اس عورت نے کہا۔ اس کی راہنمائی میں، میں غسل خانے تک پہنچ گیا۔ حوالات میں گزرے وقت نے میرا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ جسم کے کئی حصوں میں درد تھا۔ نیم گرم پانی سے بھرپور غسل لینے کے بعد میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ میں باہر نکلا تو وہ مجھے کچن میں نظر آئی۔

''بس پانچ منٹ انتظار کرو۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا اور فرائنگ پین میں موجود شامی کبابوں کو پلٹنے لگی۔ کبابوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے میری بھوک کو چمکا دیا۔ صبح ملنے والا چائے پاپوں پر مشتمل ناشتا تو جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا لیکن بھوک کا احساس ذرا سکون ملنے پر اب جاگا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے ساڑی میں ملبوس عورت کو ماہرانہ انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے دلچسپی سے دیکھا، دریافت کیا۔

''شکنتلا۔'' اس نے اپنی لوچ دار آواز میں جواب دیا۔

''یہ آپ کا گھر ہے!'' میں نے اگلا سوال داغا۔

''ہمارا ہی سمجھیے۔'' اس نے قدرے مبہم جواب دیا پھر کھانا لگانے لگی۔ کھانے میں شامی کباب کے علاوہ بکرے کے گوشت کا پلاؤ اور چکن نگٹس بھی شامل تھے۔ رائتے اور سلاد کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ''یہ اتنی بہت سی چیزیں آپ نے کس وقت تیار کرلیں؟'' میں نے ڈائننگ ٹیبل کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو وہ دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''رستم جی نے صبح فون پر بتا دیا تھا کہ ان کا ایک مہمان آنے والا ہے سو ہم نے تھوڑی بہت تیاری کرلی لیکن ہمیں زیادہ سگھڑ سمجھنے کی غلطی مت کیجیے۔ یہ شامی کباب نگٹس اور رائتا سب ڈبا پیک مارکیٹ سے منگوایا گیا ہے۔ ہم نے صرف پلاؤ اور سلاد تیار

کیا ہے۔''اس کے بولنے میں بڑی بے ساختگی تھی۔ مجھے اس سے بات چیت کرنے میں مزہ آرہا تھا اور وقتی طور پر بھول گیا تھا کہ میں کس مشکل میں پھنسا ہوا ہوں۔

''رستم صاحب سے آپ کی کیا رشتے داری ہے، کیا آپ ان کی عزیزہ ہیں؟''اس کے نام اور حلیے سے ظاہر تھا کہ اس کا رستم سے کوئی شرعی و قانونی رشتہ ہونے کا امکان نہیں پھر بھی میں نے اپنے تجسّس سے مجبور ہو کر سوال کیا۔

''نہیں لیکن ہم انہیں بہت عزیز ہیں۔''اس نے اسی بے ساختگی سے جواب دیا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب مزید سوال کرنا بدتہذیبی میں شمار ہوگا اس لیے خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''ہمارے تعارف میں کس لیے خود کو الجھاتے ہیں۔ اس مقصد پر توجہ دیجئے جس کی خاطر یہاں موجود ہیں۔''

مجھے خاموش پا کر اس نے نصیحت کی پھر اس طرح کی باتیں کرنے لگی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے میرے حالات کا اچھی طرح علم ہے۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ مجھے فیصل جیسے دھوکے باز اور مکار شخص کے ساتھ کسی رعایت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ میں خود بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں اس کے فراہم کردہ نوٹ پیڈ پر ان چیزوں کے نام لکھنے لگا جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شکنتلا نے مجھ سے میری پلاننگ کے بارے میں پوچھا اور سن کر خود بھی کئی مشورے دیے... اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ میں آرام دہ بستر پر لیٹا تو پھر کوئی ہوش نہیں رہا۔ مغرب کے بعد ہی میری آنکھ کھلی۔ میں باہر آیا تو شکنتلا نے مجھے میرا مطلوبہ سامان دکھایا۔ فہرست میں درج ہر چیز موجود تھی۔ میں سارا سامان چیک کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تو اس نے مجھے چائے پیش کی۔ چائے پینے کے دوران شکنتلا نے مجھے بتایا کہ بیرسٹر رستم ملک ایک بے حد ہمدرد انسان ہیں جو اپنے جوان بیٹے کی موت کے بعد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے ہیں۔

اس نے انکشاف کیا کہ وہ خود فلموں کے شوق میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے جو روایت کے مطابق ہیروئن تو نہ بن سکی لیکن موقع پرستوں کے ہاتھ لگ گئی۔ ابتدائی خواری کے بعد قسمت سے اس کی رستم ملک سے ملاقات ہو گئی۔ رستم ملک ایک ایسی این جی او کے کرتا دھرتاؤں میں سے تھے جو بے سہارا خواتین اور بچوں کے لیے کام کرتی ہے۔ شکنتلا کی کہانی جان کر انہیں اس سے ہمدردی محسوس ہوئی اور انہوں نے اسے مطلب پرستوں کے شکنجے سے نکال کر اس گھر میں لا بٹھایا۔ شکنتلا کے مطابق وہ یہاں خوش تھی اور عزت کی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک پل کے لیے مجھے شک ہوا کہ رستم ملک کی یہ ہمدردی بے وجہ تو نہیں ہوگی اور وہ شکنتلا کے آنچ دیتے حسن سے ضرور آگ تاپتا ہوگا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو جھڑک دیا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں ان کے بارے میں اس انداز سے سوچوں۔ اگر وہ غلط آدمی ہوتے تو شکنتلا ہرگز بھی ان کی اتنی عزت نہ کرتی۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شکنتلا نے مجھے لائٹ ساڈنر کروایا۔ ایکٹو رہنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ شکم سیری نہ کی جائے۔

ساڑھے بارہ بجے رات کو میں وہاں سے روانہ ہوا۔ میرا سامان ایک چھوٹے شولڈر بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ صرف پسٹل کو میں نے اپنے بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ ٹی شرٹ اور پینٹ پر مشتمل گہرے رنگ کا یہ لباس بھی مجھے میری فرمائش پر فراہم کیا گیا تھا۔ باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی لی اور فیصل کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ منزل کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیکسی بنگلے سے کافی پہلے ہی رکوالی۔ ان لمحات میں خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ مجھے شدید غصہ تھا کہ فیصل نے مجھے مجبور پا کر بلی چڑھانے کی کوشش کی۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ان حالات نے میرے گھر والوں کو کتنی بری طرح ڈسٹرب کیا ہوگا۔ میں نے احتیاطاً اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پولیس والے سب سے پہلے ان کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور میں دوبارہ گرفتاری سے قبل فیصل سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ بنگلے کے قریب پہنچ کر میں باہر ہی رک گیا۔ یہ بنگلا میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ حفاظت کے لیے چوکیدار کے علاوہ دو کتے موجود تھے جو رات کے وقت کھلے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ میں ان کتوں کے انتظام کا سامان ساتھ لایا تھا۔ بنگلے کی بغلی گلی میں پہنچ کر میں نے اپنا بیگ کھولا اور پلاسٹک کے تھیلوں میں سے گوشت کے پارچے باہر نکالے۔ ان پارچوں میں ایک زوداثر زہر کی آمیزش کی گئی تھی۔

میں نے دیوار کے دوسری طرف لان میں پارچوں کو پھینکا تو چند سیکنڈوں میں ہی ردعمل ظاہر ہو گیا۔ کتے ہلکی آواز میں بھونکتے ہوئے اس طرف آتے محسوس ہوئے پھر یقیناً انہوں نے گوشت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد میں نے دیوار پر چڑھ کر اندر جھانکا، گوشت میں شامل زہر نے کتوں کے معدے میں پہنچ کر اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور وہ زمین پر پڑے تڑپ

رہے تھے۔ تکلیف کی وجہ سے ان کے حلق سے دردناک آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں یقیناً چوکیدار کے کانوں تک پہنچ گئی ہوں گی۔ جب ہی وہ بھاگتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔ کتوں کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے تو تشویش سے انہیں دیکھا پھر چوکنا ہوکر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اس سے قبل کہ وہ سر اٹھا کر دیوار کی طرف دیکھتا، میں نے چھلانگ لگائی اور سیدھا اس کے اوپر جا کر گرا۔ میرا وزن پڑنے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور ہم دونوں اس طرح زمین پر گرے کہ میں اس کے اوپر تھا۔ گرنے سے مجھے بھی چوٹیں آئیں لیکن میں ان چوٹوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ چوکیدار کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکالا اور چوکیدار کے سر پر لگاتار دو وار کرڈالے۔ میں اس قسم کے کاموں میں قطعی مہارت نہیں رکھتا تھا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کی تھی کہ وہ صرف بے ہوش ہوسکے۔ چوکیدار نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے تو میں اس کے اوپر سے اتر گیا اور بیگ میں سے رسی نکال کر اس کے ہاتھ پیر باندھ ڈالے۔ اب وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو میرے لیے خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔ آگے میرا کام آسان تھا۔ میں جانتا تھا کہ چوکیدار کے علاوہ بنگلے میں کوئی دوسرا کل وقتی ملازم موجود نہیں ہوتا۔ مختلف کام انجام دینے والے ملازم زیادہ سے زیادہ رات ساڑھے دس گیارہ بجے تک وہاں سے رخصت ہوجاتے تھے چنانچہ مجھے صرف گھر کے مکینوں سے ہی نمٹنا تھا۔ جلد ہی میں نے اندر تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرلیا۔ لان کا نظارہ کرنے کے لیے بنائی گئی گلاس وال کاٹ کر اندر داخل ہونے کے لیے مجھے تھوڑی سی محنت کرنی پڑی لیکن کام صفائی سے ہوگیا۔

رستم ملک کے تعاون نے مجھے وہ سارا سامان مہیا کردیا تھا جو شاید میں خود اپنے بل بوتے پر حاصل نہ کرپاتا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں نے سیڑھیوں کا رخ کیا کیونکہ رہائشی کمرے اوپری منزل پر تھے۔ پہلے پڑنے والا بیڈروم طوبیٰ کا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شوخ وشنگ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ اس جرم میں شامل نہیں ہوسکتی تھی چنانچہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا سخت برتاؤ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بیڈروم کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ اسے اندر سے لاک نہیں کیا گیا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں، میں نے طوبیٰ کو بستر پر محوِخواب دیکھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور کلوروفام میں ڈوبا رومال اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ ذرا سا کسمسانے کے بعد بے ہوش ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے فیصل کے بیڈروم کا رخ کیا۔ اس کا بیڈروم اندر سے لاک تھا۔ میں نے مزید احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے پسٹل کی نال لاک پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا لیکن مجھے امید تھی کہ اس دھماکے کی آواز بنگلے کے اندر ہی گونج کر رہ جائے گی اور اردگرد کے بنگلوں کے مکین متوجہ نہیں ہوں گے۔ لاک ٹوٹتے ہی میں دروازے کو دھکیل کر پھرتی سے اندر داخل ہوگیا۔ فیصل ... اور اس کی بیوی ثوبیہ میرے اندر داخل ہونے تک اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی پسٹل ان پر تان دیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' مجھے سامنے پاکر فیصل برہمی کا اظہار کرنا چاہا۔

''اس بدتمیزی پر تم نے مجھے مجبور کیا ہے۔ دولت کی ہوس میں اپنی سگی بھتیجی کے خون سے ہاتھ رنگنے والے سفاک انسان تیرا یومِ حساب آچکا ہے۔ تونے اپنی یتیم بھتیجی کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا حساب تو تو اوپر پہنچ کر دینا لیکن میرے خلاف کی جانے والی سازش کا جواب تجھے ابھی اور اسی وقت دینا ہوگا۔'' میں کسی پنجابی فلم کے ہیرو کی طرف بھڑک کر بولا۔

''بکواس مت کرو۔ ہانیہ کو میں نے نہیں تم نے قتل کیا ہے۔ مجھے بتاؤ مسجد سے جوتے چرانے والے دو ٹکے کے انسان میں اتنی غیرت کہاں سے آگئی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرڈالا؟'' فیصل نے دوبدو جواب دیا۔

''یہ سارا تیرا اسٹیج کیا ہوا ہے ڈراما ہے کمینے۔ تو نے ہی جان کر اس رات مجھے ہانیہ کی ڈائری بھجوائی تھی کہ صبح اس کا قتل ہو تو پولیس کے سامنے مجھے قاتل قرار دینے کا جواز پیش کیا جاسکے۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ ہانیہ کب دبئی سے واپس آرہی ہے۔ مجھے تو نیند... سے جگا کر بتایا گیا کہ میں اپنی بیوی کا قتل کرچکا ہوں اور یہ سارا کھیل تونے کھیلا۔ تو ہے ہانیہ کا قاتل۔'' میں اتنی زور سے چیخا کہ گلے کی رگیں پھول گئیں۔

''بکواس مت کرو۔ میرے پاس ہانیہ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔'' فیصل نے پھر ایک بار میرے الزام کی تردید کی۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کیسے نہیں تھا جواز؟ جواز تو تھا۔ ہانیہ کے قتل کے الزام میں مجھے پھانسی پر لٹکانے کے بعد ایک تو ہی تو ہے اس کا سگا چچا جو اس کی دولت کا وارث قرار پائے گا۔''

''نہیں۔ ہانیہ کے قتل کے بعد مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔ اگر وہ اپنے بچے کی پیدائش تک زندہ رہتی تو اس صورت میں

پھر بھی مجھے کوئی فائدہ ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد میں اس کے بچے کا سرپرست قرار پاتا اور ہانیہ کی پراپرٹی کی دیکھ بھال بھی مجھے کرنی ہوتی، اب تو اس کی ساری پراپرٹی ٹرسٹ کو چلی جائے گی اور مجھے اپنے دس فیصد شیئرز کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔'' فیصل نے وضاحت دی تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ بیرسٹر رستم علی نے بھی مجھ سے وصیت کے سلسلے میں ایسی ہی کوئی بات کہی تھی یعنی فیصل کا واقعی ہانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد کون سا ایسا فرد تھا جس سے میں باز پرس کرتا یکدم ہی میرے ذہن میں ہانیہ کی ملازمہ خاص نسرین کا خیال آیا۔ اس نے عین ہانیہ کے قتل والی رات مجھے اس کی ڈائری دی تھی۔ اس ڈائری کے مندرجات نے مجھے قاتل ثابت کرنے میں اہم کردار کیا تھا۔ اس کے علاوہ نسرین نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر بھی چند ایسی باتیں کہی تھیں جو میرے خلاف جاتی تھیں۔ اب تک تو میں اسے فیصل کا ہی آلہ کار سمجھ رہا تھا لیکن فیصل کے پاس قتل کا کوئی محرک موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ سوال اٹھتا تھا کہ نسرین کس کے کہنے پر میرے خلاف سرگرم عمل ہے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہونے لگی کہ میں فوری طور پر اس تک پہنچوں اور باز پرس کروں۔ اسی خیال کے تحت میں نے فیصل سے اس کی بابت پوچھا۔

''وہ اپنے گھر پر ہوگی۔ ہانیہ والی کوٹھی کو تالا لگا کر میں نے فی الحال سب ملازموں کو چھٹی دے دی ہے، کوٹھی پر ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہے۔'' اس نے نہایت شرافت سے میرے سوال کا جواب دیا۔ پھر نہایت غور سے میری شکل دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا سچ مچ تمہارا ہانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟'' اس سوال سے میں جھنجلا گیا۔

''نہیں ہے میرا کوئی تعلق کیونکہ تمہارے اندازے کے عین مطابق میں سچ مچ اتنا غیرت مند نہیں ہوں کہ حقیقت جاننے پر اسے قتل کردیتا۔ میں غصے میں ضرور تھا لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ زبانی برا بھلا کہنے کے سوا تم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' بولتے ہوئے میرے اندر کی شکست و ریخت لہجے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ فیصل کے برابر میں اب تک خاموش بیٹھ کر ساری گفتگو سنتی اس کی بیوی نے ذرا ہمدردی سے مجھے دیکھا۔ دونوں میاں بیوی ابھی تک اپنے بیڈ پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''مجھے افسوس ہے لیکن تم خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو تو سمجھ سکو گے کہ میرے پاس خاندان کی عزت بچانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔'' فیصل نے کسی مجبور شخص کے سے لہجے میں کہا تو مجھے قائل ہونا پڑا۔ میں جو غصہ اور اشتعال دل میں لے کر یہاں آیا تھا اب اس کا رخ ملازمہ نسرین کی طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے اس کا پتا جاننا چاہا تو ثوبیہ نے بتایا کہ موسیٰ کالونی کے علاقے میں کہیں اس کا گھر ہے، مکمل پتا انہیں بھی نہیں معلوم تھا البتہ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ ہانیہ کے ڈرائیور کو معلوم ہوگا۔ میرا وہاں مزید رکنا بے کار تھا۔ اس لیے واپسی کے لیے مڑا۔ ٹوٹے ہوئے لاک والے دروازے کو میں نے یوں ہی بھیڑ دیا تھا۔ باہر نکلنے کے لیے میں نے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر ذرا سا ہی دروازہ کھولا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف کسی کی جھلک دکھائی دی۔ پولیس کی یونیفارم پہچاننے میں مجھے ذرا دقت نہیں ہوئی اور میں دروازے کو واپس دھکیل کر تیزی سے کمرے میں موجود سلائیڈنگ گلاس ونڈو کی طرف بھاگا۔ میرے کھڑکی کھول کر اس کی منڈیر پر چڑھنے تک پولیس والے اندر داخل ہوچکے تھے۔ کھڑکی کے عین نیچے گرل نما لوہے کا وہ جال تھا جو نچلی منزل پر ہوا کی آمد و رفت جاری رکھنے کے لیے عموماً چھت کے کچھ حصے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

''کامران رک جاؤ۔'' میرا ارادہ بھانپ کر مجھے پیچھے سے پکارا گیا۔ میں نے پکارنے والے کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی زحمت کیے بغیر چھلانگ لگادی کیونکہ ایک بار پھر پولیس کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد میں اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جال پر گرنے کے بعد جیسے ہی میں سیدھا کھڑا ہوا اوپر سے گولی چلنے کی آواز آئی اور گلاس ونڈو کے شیشے ریزہ ریزہ ہوکر برسات کی صورت میرے اوپر گرنے لگے۔ میں نے بے ساختہ ہی اپنا سر دونوں بازوؤں سے چھپا کر اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کی۔ اضطراری طور پر میرے ہاتھ میں موجود پسٹل چل گیا۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی میں نے اس کی نال سے نکلتا دھواں بھی واضح طور پر دیکھا۔

''تم پوری طرح ہمارے گھیرے میں ہو کامران۔ بھاگنے کی احمقانہ کوشش مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔''

اس بار کسی نے اوپر کھڑکی میں کھڑے ہوکر مجھے تنبیہہ کی۔ ہوسکتا ہے عالم دیوانگی میں، میں کان نہ دھرتا لیکن میں نے دیکھ لیا کہ بنگلے کے باہر بھی پولیس والے موجود ہیں۔ مجبوری میں مجھے اپنے ہاتھ بلند کرکے سرینڈر کرنا پڑا۔ پولیس والوں نے مجھے ہتھکڑیاں نہیں لگائیں لیکن ہتھیاروں کے سائے میں لیے بنگلے سے باہر نکلے۔ باہر پولیس وین کی فرنٹ سیٹ پر سادہ لباس میں موجود شخص کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ وہ عاکف وقاص تھا۔ چچا کا داماد اور

صدف کا خوش قسمت شوہر۔

☆☆☆

گرفتار ہو کر تھانے جاتے ہوئے میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ صدف کے شوہر کے ہاتھوں گرفتار ہونا کتنی بڑی ذلت تھی یہ کچھ میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔ میں پورا راستہ خاموش رہا۔ عاکف نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی لیکن تھانے پہنچ کر صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ عاکف نے وہاں ایک کمرے میں مجھ سے تنہائی میں ملاقات کی۔

''مجھے افسوس ہے کامران صاحب کہ مجھے اس طرح آپ کو گرفتار کروا کر یہاں لانا پڑا لیکن امید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھ سکیں گے۔ مجھے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے یہ فریضہ انجام دینا ہی تھا۔'' وہ بڑی اپنائیت سے میرے سامنے وضاحت پیش کررہا تھا۔ میں بغیر کسی ردِعمل کے سنتا رہا۔

''میر انکل آپ کے لیے بہت پریشان تھے اور انہوں نے ہی مجھ سے اس کیس کو دیکھنے کی درخواست کی تھی۔ انہیں پورا یقین تھا کہ آپ پر قتل کا جھوٹا الزام لگا کر کوئی سازش کی گئی ہے۔ ان کے اس یقین نے ہی مجھے مجبور کیا کہ میں اس کیس کو خود ہینڈل کروں۔'' وہ حکومت کے ایک خفیہ ادارے سے وابستہ تھا اور اس طرح کے کیسز دیکھنا اس کا کام نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اپنے سسر یعنی میرے چچا کی فرمائش بھی رد نہیں کرسکتا تھا۔ چچا کی خود سے بےلوث محبت نے ایک بار پھر مجھے مقروض کردیا۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے پریشان تھے جو ان کی لاڈلی بیٹی کو چھوڑ کر اپنی قسمت بنانے کے لیے راہ بدل گیا تھا۔

''آپ کے عدالت سے فرار نے کیس کو خاصا خراب کردیا تھا تاہم میں نے تمام معلومات حاصل کر کے یہ اندازہ تو لگالیا تھا کہ آپ کن کن مقامات کا رخ کرسکتے ہیں۔ ہانیہ حسین والی کوٹھی، آپ کے اپنے گھر اور فیصل صاحب کا بنگلا، یہ تین جگہیں تھیں جہاں آپ کے جلد یا بدیر پہنچنے کا امکان تھا۔ میں نے تینوں جگہوں پر پولیس کے سپاہی تعینات کردیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کوئی حماقت کریں اور یہ کیس مزید الجھ جائے۔'' میری خاموشی سے بےنیاز وہ بولے جارہا تھا۔

''آپ کا کیس جس طرح سامنے آیا اس میں مجھے ملازمہ نسرین کا کردار سب سے زیادہ اہم لگا کیونکہ اس کی گواہی نے ہی آپ کو قاتل ثابت کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے آپ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے فرار نہیں ہوسکے تھے لیکن میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ایک قاتل ہر حال میں سب سے پہلے موقع واردات سے فرار کی کوشش کرتا ہے لیکن آپ تو پولیس والوں کو اپنے بیڈروم میں سوئے ہوئے ملے تھے۔ بس اسی بنیاد پر میں نے نسرین کو گرفتار کروالیا۔ پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتی رہی لیکن جب اسے لیڈی پولیس کے حوالے کیا گیا تو اس نے سب اگل دیا۔ وہ ہانیہ حسین کی سب سے خاص ملازمہ تھی اس لیے اسے علم تھا کہ وہ کب دبئی سے واپس آرہی ہے۔ چنانچہ اس نے اس شخص کو اطلاع دے دی جس نے اس خدمت کے عوض اسے بھاری رقم ادا کی تھی۔ نسرین کے خیال کے مطابق آپ کو ہانیہ صاحبہ کی ڈائری پہنچا دینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ اس پر صورتِ حال کی خطرناکی اس وقت کھلی جب ہانیہ قتل کردی گئی اور اسے جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کیا گیا۔ وہ پھنس چکی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گواہی دینی پڑی۔ ادھر آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہانیہ کے قتل میں آپ کو پھنسانے کے بعد فائدہ اس کے چچا کو حاصل ہوگا اس لیے آپ انہیں مجرم سمجھتے ہوئے ان سے حساب کتاب کرنے ان کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں نے ہدایت کے مطابق آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بجائے ہمیں اطلاع دے دی اور یوں ہم آپ کو یہاں لانے میں کامیاب ہوگئے۔'' وہ مجھے ساری تفصیل سنا رہا تھا۔

''نسرین کو ٹریپ کرنے والا شخص کون تھا؟'' میں نے بےچینی سے سوال کیا کہ اسی سوال کے جواب میں ہانیہ کے قاتل کا نام جانا جاسکتا تھا۔

''معلوم نہیں۔'' عاکف نے اپنے شانے اچکائے۔ ''نسرین کا کہنا ہے کہ اس سے فون پر رابطہ کیا جاتا تھا جبکہ رقم ایک مخصوص وقت پر کوئی شخص کپڑے میں لپیٹ کر چار دیواری کے اندر ایک مخصوص جگہ پھینک گیا تھا۔''

''ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے وہ کوئی ایسا فرد ہوگا جسے ہانیہ کی موت سے فائدہ پہنچے لیکن موجودہ حالات میں تو ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔'' میں نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

''ہاں بظاہر تو ایسا کوئی نہیں ہے لیکن میں آپ کو ایک دلچسپ حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔'' عاکف کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''ہانیہ حسین کے قتل کا فیصلہ بہت پہلے ہی ہوچکا تھا اور قربانی کا بکرا بنانے کے لیے بھی آپ کا انتخاب کرلیا گیا تھا لیکن یہ قتل پلاننگ کے مطابق چند ماہ بعد اس وقت ہوتا جب ہانیہ کا بچہ دنیا میں آجاتا اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں فائدہ کس کا ہوتا۔''

''ہانیہ کے انکل فیصل کا۔'' میں نے بےساختگی سے

جواب دیا۔

''بالکل صحیح لیکن ہوا یہ کہ اس سے پہلے ہی کسی اور نے کام کر دکھایا اور فیصل ہاتھ ملتا رہ گیا۔ مجھ پر یہ اہم انکشاف فیصل کی بیٹی طوبیٰ نے کیا ہے۔ وہ اور ہانیہ بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ اتفاقاً ایک دن طوبیٰ نے اپنے ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی لیکن فوری قدم اس لیے نہیں اٹھایا کہ فوری طور پر اسے ہانیہ کے قتل کا ڈر نہیں تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھائے لیکن ہانیہ قتل ہوگئی تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے اپنے والدین پر شک ظاہر کر دیا لیکن میں نے جان بوجھ کر فیصل کو نہیں چھیڑا اور صرف نگرانی کرواتا رہا کیونکہ میرے لیے یہ نکتہ بہت اہم تھا کہ فیصل کو ہانیہ کی موت کا فائدہ اسی صورت ہوسکتا تھا کہ وہ صاحب اولاد ہوتی اور بچے کی سرپرستی کے بہانے فیصل ... فائدہ اٹھاتا رہتا۔ یہاں تو مجھے کوئی اور ہی ہاتھ ملوث نظر آرہا تھا۔''

''پھر کیا اندازہ لگایا آپ نے؟ میں تو ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں جو ہانیہ کی موت سے فائدہ اٹھاسکے۔'' میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو فرار کروانے میں کس شخص نے مدد دی؟'' عاکف نے مجھ سے ایک بالکل مختلف سوال کیا تو میں چونک گیا اور فوری طور پر جواب نہیں دے سکا۔ رستم ملک نے میری مدد کی تھی اور میں اسے یوں پھنسوانا نہیں چاہتا تھا۔

''آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ از خود فرار ہوئے تھے کیونکہ یہ کوئی ایسا آسان کام نہیں ہوتا۔ پھر آپ فرار کے چند گھنٹوں بعد ہی جس طرح پوری تیاری کے ساتھ فیصل کے بنگلے میں داخل ہوئے اس سے بھی ظاہر ہے کہ کوئی ہے جو آپ کی بھرپور مدد کرتا رہا ہے۔'' عاکف کا انداز بے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ میں اس سے مزید چھپانے کی ہمت نہیں کرسکا۔

''ہانیہ کے وکیل رستم ملک نے میری مدد کی کیونکہ فیصل نے ہانیہ سے محبت کے جرم میں ان کے جوان بیٹے کامران کو ٹریفک حادثے میں قتل کروا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کامران کی طرح میں بھی فیصل... کی کسی سازش کا نشانہ بنوں۔'' میں نے آہستہ سے بتایا۔

''دوسرے الفاظ میں وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو آپ کے ہاتھوں سے سزا دلوانا چاہتے تھے۔'' عاکف نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو میں چپ رہ گیا۔ حقیقت اس کے برخلاف نہیں تھی۔ رستم ملک کا نام جاننے کے بعد عاکف نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

اس کے بعد مجھے پولیس اسٹیشن کے ہی ایک کافی بہتر کمرے میں رکھا گیا اور وہاں سلوک بھی بہتر ہی ہوتا رہا۔ بعد میں عاکف نے اس کیس پر کام کر کے جو کچھ نتائج حاصل کیے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہانیہ کی دولت کے لالچ میں رستم ملک ہی نے اپنے بیٹے کو ہانیہ کے پیچھے لگایا تھا۔ کامران حقیقتاً ایک آوارہ مزاج لڑکا تھا جس نے نہایت کامیابی سے ہانیہ کی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندھ دی لیکن فیصل رستم ملک جیسے چالاک اور ہوشیار آدمی کے بیٹے سے ہانیہ کی شادی کے لیے کسی طور تیار نہیں تھے۔ اس دوران میں اتفاق سے شدید نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے کامران حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ رستم ملک نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے بیٹے کا قاتل فیصل... ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رستم کوئی اتنا بے بس آدمی نہیں تھا کہ خاموش بیٹھ جاتا۔ بہرحال کامران کی موت کے بعد جب فیصل کو ہانیہ کی حالت کے بارے میں علم ہوا تو اس نے اپنا منصوبہ تیار کرلیا۔ ہانیہ قتل ہوجاتی، میں پھانسی چڑھ جاتا تو وہی ہوتا جو بچے کا سرپرست بننے کے بعد عیش کرتا لیکن رستم ملک اس منصوبے کے آڑے آگیا۔ اسے کامران کے سامان میں سے ہانیہ کی ڈائری اور کچھ دوسری ایسی چیزیں مل گئی تھیں جنہوں نے اسے اپنا منصوبہ تیار کرنے کی راہ سجھائی۔ فیصل... اور رستم ملک دو ایسے افراد تھے جن کے درمیان ہانیہ کی جائداد کے حصول کے لیے رسا کشی جاری تھی۔ رستم ملک نے اپنے بیٹے کی مدد سے ہانیہ کو ٹریپ کر کے تقریباً کامیابی حاصل کرلی تھی۔ لیکن فیصل ہانیہ سے اپنے رشتے کا فائدہ اٹھا کر کامران اور ہانیہ کی شادی کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ ہوسکتا تھا کہ رستم ملک بیٹے کی مدد سے ہانیہ کو بغاوت کی راہ پر بھی ڈال دیتا لیکن کامران کو پیش آنے والے حادثے نے سب کچھ تبدیل کر ڈالا۔ گھر آتی لکشمی راہ بدل گئی اور اس کے حریف فیصل... کے لیے راہیں کھلنے لگیں۔ ہانیہ سے بے پناہ محبت جتانے والا فیصل... اگر اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجاتا تو دولت پر اس کا قبضہ ہوتا۔

اعتذار

کراچی سے ہمارے ایک محترم قاری نے بذریعہ فون ''ہار جیت'' کے عنوان سے شائع ہونے والی کہانی کے ایک فقرے پر بجا اعتراض کیا ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ مذکورہ فقرہ سہواً شائع ہوا۔ ہم تمام تر احتیاط کرتے ہیں کہ کسی لفظ یا فقرے سے کسی معزز قاری کی دل آزاری نہ ہو۔ آئندہ اس ضمن میں مزید احتیاط کی جائے گی۔ (ادارہ)

چنانچہ رستم ملک نے بروقت کارروائی کی۔ ہانیہ قتل ہوگئی، میں قاتل نامزد ہوگیا اور بعد میں اس نے مجھ سے ہمدردی جتا کر فیصل... کا کانٹا بھی ہمیشہ کے لیے نکالنے کی کوشش کی۔ اس رات اگر میں فیصل... کو جذبات میں آ کر قتل کرڈالتا تو آج دوہرے قتل کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ مجھ جیسے بے حیثیت آدمی کے کیس کی پیروی کے لیے ڈھنگ کا وکیل کرنا بھی مشکل ہوجاتا اور شاطر رستم ملک سکھ کی بانسری بجاتا ہوا ہانیہ کی دولت پر عیش کرتا کیونکہ ہانیہ کے بے اولاد مرنے کی صورت میں رقم جس ٹرسٹ کو منتقل ہوتی اس کا کرتا دھرتا خود رستم ملک ہی تھا۔ رستم ملک جس کردار کا مالک تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے پناہ کی تلاش میں اس تک پہنچنے والی شگفتہ کو رکھیل بنا کر ایک گھر میں ڈال رکھا تھا۔ یہ اور بات کہ در در رسوا ہوتی شگفتہ نے ہر روز ایک نئے بندے کے ہاتھوں لٹنے کے مقابلے میں ایک شخص تک محدود ہونے کو قبول کرلیا تھا اور اپنی موجودہ حیثیت پر تقریباً خوش ہی تھی لیکن رستم ملک کی مکاری کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ ایک طرف وہ جوان بیٹے کی موت پر رنجیدہ ہونے کا ڈھونگ کرتا تھا تو دوسری طرف اس بیٹے کی نشانی کو دنیا میں آنے سے قبل ہی مٹا ڈالا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم دوست عنایت سے بھی دھوکا کیا تھا حالانکہ عنایت حسین نے اپنے سگے بھائی سے زیادہ اسے عزت واہمیت دی تھی۔ رستم ملک کو میں نے ٹی وی پروگرامز میں بھی دیکھا تھا۔ اپنی این جی او کے حوالے سے عورتوں پر ظلم وستم اور ان کی عصمت دری کے واقعات بیان کرتے ہوئے وہ باقاعدہ آبدیدہ ہوجاتا تھا لیکن حقوق نسواں کے اس علم بردار نے اپنی پناہ میں آنے والی ایک لڑکی کو رکھیل بنا کر ثابت کردیا تھا کہ اس کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص اتنا سخت دل ہو کہ اپنی جوان اولاد کے مرنے کے بعد بھی دولت کے لیے چالیں چلتا پھرے وہ دنیا میں کچھ بھی کرسکتا ہے جیسا کہ اس نے ہانیہ کو قتل کردیا تھا۔ بے چاری ہانیہ نے اپنی دولت کی وجہ سے ہر ایک سے دھوکا کھایا اور اپنی دولت ہی کی وجہ سے ماری گئی۔ یہ دولت بھی عجیب شے ہے۔ پاس ہو تو بھی قاتل، نہ ہو تو بھی قاتل۔ ہانیہ اپنی دولت کی وجہ سے قتل ہوئی تھی اور میں دولت کے نہ ہونے سے جیتے جی قتل ہوا تھا اور اپنی ماں کو بھی نہیں بچاسکا تھا۔ جی ہاں...... وہ کینسر سے تو نہیں مری تھیں لیکن مجھ پر قتل کا الزام سن کر انہیں ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا اور وہ چند دن آئی سی یو میں رہنے کے بعد چل بسی تھیں۔ مجھے رہا ہونے کے بعد پہلا صدمہ ان کی میت کو کاندھا دینے کا ہی اٹھانا پڑا تھا۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ رستم ملک نے کرائے کے قاتل کی مدد سے ہانیہ کو قتل کروایا تھا، مجھے رہا کردیا گیا تھا۔ فیصل بھی اپنے تمام تر گھناؤنے کردار کے باوجود آزاد تھا کہ اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

آج اس واقعے کو چار برس گزر گئے ہیں لیکن میں اس کے اثرات سے نہیں نکل سکا حالانکہ ان چار برسوں میں کیا کیا تبدیلیاں نہیں آئیں۔ محبت میں قربانی دینے کا سلیقہ رکھنے والی صدف آج دو پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے اور عاکف کی چاہت بھری قربت میں سکھ کی زندگی گزار رہی ہے۔ عاشفہ کی بھی شادی ہوچکی ہے اور سنبل اور شمائلہ منگنی شدہ ہیں۔ جبران اپنی محنت اور لگن سے میڈیکل کالج میں پہنچ چکا ہے۔ وہ ایک ذہین طالب علم ہے اس لیے اسکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ شام کے اوقات میں ایک دو بڑے گھرانوں میں ٹیوشنز دیتا ہے چنانچہ مجھ پر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ البتہ شمائلہ کے سلسلے میں، میں اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔

رہائی کے بعد عاکف کے تعاون سے مجھے ایک ملازمت مل گئی تھی جو بہت پرکشش نہ سہی لیکن بری بھی نہیں ہے۔ باقی کسر میں اکیڈمی میں پڑھا کر پوری کرلیتا ہوں اور عزت سے گزارہ ہوجاتا ہے لیکن ایک احساس زیاں ہے جو جان نہیں چھوڑتا۔ صدف کو عاکف کے ساتھ دیکھتا ہوں تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے لیکن مجھے پوری ایمان داری سے یہ اعتراف ہے کہ صدف جیسی لڑکی اس جیسے نفیس انسان کو ڈیزرو کرتی۔ اگر چچا کی درخواست پر عاکف میرے کیس پر توجہ نہ دیتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ جیل میں یا پھر زندگی بچانے کی کوشش میں دربدر ہوتا۔ اس کا مجھ پر احسان ہے کہ آج میں کم از کم اپنوں کے درمیان تو موجود ہوں۔

چچا آج بھی روزِ اول کی طرح میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ اکثر مجھ سے شادی کے لیے بھی اصرار کرتے ہیں لیکن میں انہیں ٹال جاتا ہوں۔ کیا کہوں اور کیسے بتاؤں کہ مجھ جیسے تہی داماں کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انسان کے پاس سب سے اہم متاع اپنی ذات کا غرور ہوتا ہے اور میں اسی سے محروم ہوگیا تھا۔ شاید زندگی جینے کے لیے شارٹ کٹ تلاش کرنے والے مجھ جیسے ہر شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔ زندگی کو پوری جدوجہد اور خلوص کے ساتھ نہ برتو تو یہ جواب میں ایسا وار ضرور کرتی ہے جس کا گھاؤ گہرائی تک اثر کرتا ہے۔ اب یہ سمجھنے اور محسوس کرنے والوں پر ہوتا ہے کہ اس گھاؤ کو پہچان پاتے ہیں یا نہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM